ناولٹ

خوشبو کا دریا

رفعت سراج

؎ لوح جبیں پر ثبت ہے روداد زندگی
ہر چند کہ بے زبان ہوں مگر بے زباں نہیں

"وہاج حسین ولد معراج حسین بعوض دس ہزار روپے مہر سکہ رائج الوقت نصف معجل نصف موجل ارجمند بیگم ولد دکاش رائے کو تمہارے نکاح میں دیا۔ کیا تم نے قبول کیا؟"

ایک سکوت لمحہ بھر کے لیے چھا گیا۔ معراج حسین نے اپنے بیٹے کے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو اضطراری انداز میں پہلو بدل کر دیکھا۔ ان کا بس نہ چلتا تھا خود بول پڑیں کہ قبول کیا۔

ایک دم اتنی ساری نظریں خود پر جمی دیکھ کر وہاج حسین نے ہڑبڑا کر کہا: "قبول کیا۔"

اپنے الفاظ تین مرتبہ دہرانے کے بعد قاضی صاحب نے نکاح فارم وہاج حسین کے سامنے کیا اور دستخط کے لیے رہنمائی کرنے لگے۔ اس کے بعد وہاج حسین کے بڑے بھائی منہاج حسین کے دستخط بطور وکیل لیے اور دو گواہوں کے دستخط ہونے کے بعد مبارک باد دی۔ سب طرف سے

Scan & PDF
FIAZ AHMED
Friends Korner.com

مبارک باد کی آوازیں آنے لگیں۔

دولہا دلہن سے ایجاب و قبول کے بعد چھوہارے تقسیم ہونے لگے۔

سجو نے چھوٹی ممانی کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ "ہمیں بھی۔"

اور چھوہارے مٹھی میں بھر کر اپنی پھوپھی زاد کو آنکھ مار کر بولی۔ "سنا ہے نکاح کے چھوہارے کھانے سے جلدی نمبر لگتا ہے۔"

"ٹھیک ہی سنا ہے۔ اسی لیے میں نے تمہارے ساتھ ہی چھوہارا منہ میں ڈالا ہے کہ نمبر ایک ہی دن لگے۔" پشت سے ایک شوخ مردانہ آواز آئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے حماد حسین کھڑا تھا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"بہت وہ ہو تم — ہم تو ویسے ہی مذاق کر رہے ہیں۔" وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ اس کی کزن کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہوں تو یہ بات ہے۔"

"ارے نہیں — توبہ۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ صرف دو سال ہی تو بڑا ہے بس ایسے ہی تنگ کرتا ہے۔ چلو آؤ۔ بیچارہ ابا جان کی شادی پر کچھ زیادہ ہی خوش ہو رہا ہے۔ چلو آؤ بھی تو دیکھیں، کیسی لگ رہی ہیں —"

"ارے سچ بہت حسین لگ رہی ہیں۔ میں تو دیکھ کر آ رہی ہوں۔ واہ کیا حسین ماں ملی ہے حماد کو۔ ویسے حماد نے زیادہ محسوس نہیں کیا جیسا کہ سب کو خدشہ تھا۔ اچھا ہی ہوا۔" نادیہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

دونوں دلہن کے کمرے میں پہنچیں تو وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں۔ سرخ ساڑھی اور ہلکے ہلکے میک اپ اور خوبصورت زیورات میں آنکھیں موندے تصوراتی کہانیوں کی شہزادی لگ رہی تھیں۔

"نمسکار دیوی جی!" الہڑ سی سجو نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ دلہن نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ بری طرح چونک کر — پھر سجو اور نادیہ کو دیکھ کر مسکرا دیں۔

"آؤ۔ بیٹھو۔"

"کہاں تھیں۔ اتنی دیر سے؟" انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

"دولہا کی طرف۔ وہ ہاں ہی نہیں کر رہے تھے۔ دادا جان چابک منگوا رہے تھے۔" وہ ہنس پڑی۔ دلہن کی آنکھوں میں اداسی تیر گئی۔

"کیا سچ؟" آواز میں افسردگی تھی۔

"ارے نہیں ممانی جان!" نادیہ جلدی سے بولی۔ "یہ تو مذاق کر رہی ہے۔ ماموں جان نے تو تین مرتبہ با آواز بلند کہا۔ قبول کیا — قبول کیا — قبول کیا۔" نادیہ ہنسی۔

تب ارجمند بھی جھینپ کر مسکرا دی۔ اسی دم نادیہ کی امی اندر داخل ہوئیں۔

"ارے لڑکیوں! تم یہاں ہو۔ جاؤ باہر دیکھو کتنا کام ہے۔" پھر بھاوج کی طرف پلٹیں۔

"کھانا لے آؤں ارجمند؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"جتنی بھوک ہے کھا لو۔ اتنی افراتفری میں پھر کسی کو یاد رہے نہ رہے۔" انہوں نے سرد سے انداز میں کہہ کر باہر کا رُخ کیا۔ وہ دونوں بھی اُن کے پیچھے چل دیں۔

زخم ہی کھولنے آئی ہے تو عجلت کیسی

چھو میرے زخم کو لیکے بادِ صبا آہستہ

ڈیڑھ بج چکا تھا۔ ارجمند کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ جیسے ہی کمرے میں جوتوں کی چاپ ابھری ان کا دل خدشوں وخوف سے لرزنے لگا۔

دروازہ چرچرایا۔ گویا بند کیا گیا!

وہ سانس روکے بیٹھی رہی۔

مگر جب دیر تک کوئی آواز نہ ابھری تو نگاہ اٹھا دیکھا وہاج حسین لباس تبدیل کر چکے تھے اور سفید کرتے پاجامے میں بے اندازہ باوقار لگ رہے تھے۔ خوبصورت وجیہہ چہرے پر تفکرات کا جال بکھرا تھا۔ ان کا اونچا لمبا وجود اسے بڑا کمتری سا احساس دینے لگا۔

کنپٹیوں پر کہیں کہیں جھلک دکھاتے سفید بال اسے ننھی بچی کی طرح مرعوب کرنے لگے۔ اسی دم ان کی خوابیدہ نگاہیں اس کی سمت اٹھیں۔ اس نے تیزی سے نظریں جھکا لیں۔

سرخ ساڑھی میں ملبوس، لہروں کی طرح سرکش سا سنگ مرمر کا وجود تھرتھرانے لگا۔

گول حسین چہرے پر چھائی خوف و شرم کی جھلکیاں۔ انہوں نے نگاہیں چرا لیں۔ اور گویا ہوئے۔

"ارجمند بیگم! آپ کی ایک حماقت نے مجھے ہمیشہ کے لیے سب کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ یہ اس قدر بڑی بات ہے کہ شاید میں آپ کو ساری عمر معاف نہ کر سکوں۔ میں اپنے بیٹے سے نگاہ ملا کر بات کرنے کے قابل نہیں رہا۔ کیا یہ میرا المیہ نہیں کہ میں اپنے بیٹے سے اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے ہچکچاؤں گا۔ میرا بیٹا — میری ساری عمر کی کمائی۔" کمرے کے سکوت میں ارتعاش پیدا ہوا۔ "میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔" ان کی آواز دھیمی و شکست خوردہ ہو گئی۔ "کیا یہ آپ کا بھی فرض نہ تھا کہ آپ بھی تمام صورت حال گھر والوں پر واضح کرتیں، ان کی غلط فہمی دور کرتیں۔ اور جب گھر والوں نے نکاح کی بات کی تو آپ انکار کر کے میرا تھوڑا بہت بھرم رکھ لیتیں؟ آخر ایسا آپ نے کیوں کیا؟ جب کہ آپ کی اور میری عمروں میں بھی بے حد فرق ہے۔ مجھے اپنے بیٹے پر ناز ہے۔ مجھے علم ہے کہ وہ گری ہوئی شخصیت کا مالک نہیں۔ اسی وجہ سے مجھے کسی کی بات پر اعتبار نہیں تھا۔ نہ ہی میرا آپ کے بارے میں کوئی غلط خیال تھا۔ آپ کی ایک حماقت میری زندگی کا روگ بن گئی ہے۔" وہ بڑی وضع سے اپنی بات کہہ کر پلٹے۔

"سنیے!" ارجمند کی مدھم اور آزردہ آواز کمرے کے سکوت پر چھا گئی۔ وہ اسی طرح کھڑے رہے۔ وہ ساڑھی سنبھالتی ان کے قریب چلی آئی۔

"میرا گواہ تو آپ کا میرا خدا ہے۔ اس کے بعد آپ کا بیٹا جس نے میری پاکبازی کی گواہی دے کر مجھے سب کے سامنے سرخرو کر دیا تھا۔ مگر اس کی یہ گواہی آپ نہ سن سکے۔ اور میں صرف اور صرف آپ پر اپنی پاکبازی اور بے گناہی ثابت کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ کوئی مجھے کیا کہتا ہے۔ مجھے تو اس کی پروا تھی کہ آپ کہیں مجھے غلط نہ سمجھ بیٹھیں۔ مجھے صرف آپ کی پروا تھی۔ میں دن کے اجالوں سے خوف زدہ تھی۔ رات کے سناٹوں میں اپنی پاکبازی جتانے چلی تھی۔ اور آپ پوچھتے ہیں۔ میں نے یہ سب کیوں کیا؟ مجھے نہیں پتہ — کچھ نہیں پتہ۔" وہ رو پڑی۔ "کیا آپ اتنی بات نہیں سمجھ سکتے۔ کیا یہ بھی کوئی سمجھانے کی بات ہے؟" وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔ "آپ مجھے معاف کر دیجیے۔ خدا کے لیے —" وہ بری طرح رو پڑی۔

"دیکھو ارجمند بیگم! مجھے اس طرح پریشان نہ کرو۔ میں تمہاری کوئی بھی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ تمہارے لیے عمر بھر کے لیے سزا ہے جو تم نے خود منتخب کی ہے۔ تمہارے مہر کی رقم میں جلد ہی دے دوں گا تمام۔ نہ میں تمہیں ہاتھ لگانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے مہر کے لیے جلدی نہیں ہے۔ اس وقت میرے پاس دس ہزار نہیں ہیں صبح بینک جاؤں گا اور تمہارا حق تمہیں دے دوں گا۔ اور سن لو! میں اب اس وطن میں بھی نہیں رہنا چاہتا۔ تصور کرو تم کتنے عذابوں میں گھر گئی ہو۔ خدا معلوم تم کون ہو کتنی سچی ہو۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

"میں کون ہوں — میں کون ہوں — یہ آپ کیا کہہ گئے۔ آپ کے ابا میاں تو کہہ رہے تھے۔ مسلمان بہت وسیع النظر اور فراخ دل ہوتا ہے۔ تعصبات سے پاک۔ میں ایک عورت ہوں وہاج حسین — ایک انسان جو اپنی پیدائش پر قادر نہیں ہوتا جسے بھگوان نہیں۔ اللہ تعالیٰ کہیں بھی پیدا کر دیتا ہے ایک خاکی جسم ماں کے پیٹ میں پلتا ہے۔ اور روح آسمانوں سے آتی ہے ان کا رہنما خدا ہوتا ہے۔

میں اب جو ہوں آپ جیسی ہوں۔ وہاج حسین مجھے قبول کر لیجیے۔" وہ سسک پڑی۔

حسین گلعذار سے پھولوں کو ترستا جاؤں

مسکراتی ہوئی محفل سے سسکتا جاؤں

ربِ عالم میری تقدیر بدل دے ورنہ

تیری دنیا کو بھی کچھ نہ سمجھتا جاؤں

"بھگوان آپ کے سنسار کی رکھشا کرے (حفاظت کرے) پانی پلا دیں پانی —"

"ہائیں۔ تمہارے بھگوان کے رکھشا کیسی بھی ہوتے ہیں۔" سجو جو اچھل کر گیٹ پر لٹک رہی تھی۔ بناوٹ سے چونک کر بولی۔

امی نے اسے سرزنش کے انداز میں گھورا مگر وہ نگاہ بچا گئی۔

اس لڑکی نے سہمی نظروں سے اپنے سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھا اور خشک زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "پانی پلا دیں گی۔"

"ہاں، ہاں۔ سجو جاؤ پانی لاؤ۔" سجو نے سبز سوتی

ساڑھی میں لپٹی دلکش و شکستہ لڑکی کو دیکھا اور گیٹ سے اُتر گئی۔

ابا میاں نے نہایت شفقت سے پوچھا۔
"کون ہو بیٹی؟ کہاں سے آرہی ہو؟ اندر آجاؤ۔"
امی جو ابھائی گیر عورتوں سے خوفزدہ تھیں۔ اب تک گیٹ سے باہر ہی کھڑا کر کے معلومات کر رہی تھیں مگر سسر کے کہنے پر ایک طرف ہو گئیں۔ لڑکی پورچ کے ٹھنڈے شیڈ میں آگئی۔ مگر ایک دم چکرا کر گر پڑی۔ سجو پانی لے آئی تھی۔ امی نے جلدی سے لڑکی کو تھاما۔ مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ امی نے شش و پنج میں پڑ کر سسر کو دیکھا۔
"اندر لے چلو دُلہن! لڑکی بیمار معلوم ہوتی ہے۔"
امی اسے سجو کے کمرے میں لے آئیں۔ اس کی چھوٹی سی پوٹلی سجو نے اٹھائی تھی اور خود بھی اسے کمرے میں پہنچانے کے لیے ماں کی مدد کی تھی۔
تھوڑی تدبیروں کے بعد وہ ہوش میں آگئی۔ امی نے پانی پلایا۔
لڑکی بے طرح حسین و طرح دار نظر آرہی تھی۔ حد درجہ سادہ۔
"کہاں سے آرہی ہو بیٹی؟" ابا میاں نے دریافت کیا۔
"حے۔۔۔ حیدر۔۔۔ آباد سے۔"
"اب شام ڈھلے۔۔۔ اکیلی؟" امی حیران ہوئیں۔
"سنسار میں اکیلی ہوں۔"
"جانا کہاں ہے؟" ابا میاں نے پوچھا۔
"پتہ نہیں۔"
"ارے تائی اماں! ان عورتوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔" حماد جانے کب آگیا تھا۔ تلخی سے بولا۔
"ارے نہیں بیٹے! بے چاری کی حالت دیکھو۔" امی نے ہمدردی سے کہا۔
"تائی اماں! آپ کو اس طرح بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بے زاری سے بولا۔
"آپ مجھے کوئی ایسا ٹھکانہ بتا دیں۔ جہاں میں دو ہفتے کاٹ لوں۔"
"کہاں کی ہو تم؟"
"رام جانے کہاں کی ہوں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں گویا تھی۔
"میں پانچ سال کی تھی جب مدراس سے چاٹگام (بنگلہ دیش) آئی تھی۔ میری ماں نے میرے باپ سے طلاق لے لی تھی مگر میری ماں مر گئی۔ میرے پتا جی کو پتہ چلا تو انہوں نے میری پشتی ماں (پھوپھی) کو سندیس بھیجا کہ وہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں۔ وہ مجھے کھلنا بن لے آئیں۔ وہ ابھاگن تھیں اکیلی رہتی تھیں۔"
"کھلنا بن کیا ہے؟" سجو نے تجسس سے پوچھا۔
"بڑے مشہور جنگل ہیں جی دیش کے۔"
"میری چھوٹی پشتی ماں یہاں سندھ میں رہتی ہیں۔ دو مہینے ہوئے میں بڑی پشتی ماں کے سنگ آئی تھی میری بڑی پشتی ماں مر گئیں۔ وہ سویرے پوجا کو گئی تھیں مندر میں گر گئیں۔" لڑکی رونے لگی۔
کمرے میں ایک تکلیف دہ تاثر چھا گیا۔
"میری چھوٹی پشتی ماں اندھی ہیں۔ ان کا بیٹا پرتاب دیو بہت اوباش ہے۔ وہ مجھے تنگ کرتا ہے۔ آج صبح سویرے اس نے بہت دارو پی لی تھی۔ وہ مجھے پوجا کے بہانے مندر لے گیا۔ وہاں پجاری نے اس کے اور میرے ماتھے پر تلک لگا کر پرشاد دیا۔ گیندے کے ہار پہنائے۔ پرتاب نے دیوی کو نذر دی۔ باہر آکر کہنے لگا سندری! میرا نام سندری ہے۔ میرا تیرا بیاہ ہو گیا۔
یوں بیاہ نہیں ہوتا۔ میرا بیاہ نہیں ہوا۔ میرا بیاہ نہیں ہوا۔ یوں بیاہ نہیں ہوتا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
"میں اپنے دیش جانا چاہتی ہوں۔ میں حیدر آباد سے بھاگ آئی ہوں۔"
سب دم بخود اس کی کہانی سن رہے تھے۔
اسی دم منہاج حسین (سجو کے پاپا) اندر آگئے۔ امی انہیں دیکھ کر لپک کر ان کے پاس گئیں اور تمام روئیداد بتانے لگیں۔
"کاغذات ہیں تمہارے پاس بی بی؟" انہوں نے حلم سے پوچھا۔
لڑکی نے اپنی پوٹلی سے پاسپورٹ نکالا۔ وہ پڑھنے لگے۔
"رقم ہے تمہارے پاس؟ بنگلہ دیش جانے کے لیے؟"
"نہیں، میں اسٹیشن سے پیدل آرہی ہوں۔ حیدر آباد سے یہاں کا ٹکٹ لیا تھا۔ پیسے ختم ہو گئے۔ میں نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔"
امی کا حساس دل بھر آیا۔
"جاؤ سجو! کچھ کھانے کو لے آؤ۔"
امی کے علاوہ سب کمرے سے چلے گئے۔

انہوں نے اس کی سندر سی صورت دیکھتے ہوئے خالص عورتوں والا سوال کیا۔
"تمہارے ماں باپ کہاں کے تھے؟" شاید وہ اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھیں۔
لڑکی حد سے زیادہ سمجھدار نکلی۔ اس نے تفصیلاً سب بتا دیا۔ یہ جان کر کہ اگر ان لوگوں کی ہمدردی نہ پاسکی تو پھر وہ اندھیری رات میں کہاں ماری ماری پھرے گی۔
"میرے پتا جی کا جنم بھومی (جائے پیدائش) راج گڑھی ہندوستان ہے۔ ہم راٹھے خاندان کے ہیں۔ میری دونوں پشتی ماؤں (پھوپھیوں) کا شادی بیاہ ہندوستان سے باہر ہوا۔ ایک بنگلہ دیش گئیں اور ایک مغربی پاکستان۔ میری ماتا جی بھی بنگلہ دیش کی رہنے والی ہیں۔ پتا جی انہیں بیاہ کر راج گڑھی لے گئے تھے۔ مگر طلاق کے بعد وہ واپس بنگلہ دیش آگئیں۔ میں میٹرک میں تھی جب میری ماں مجھ سے جدا ہو گئیں۔
آپ لوگ دھن والے ہیں۔ بس اتنی پرارتھنا (استدعا) ہے مجھے میرے دیش بھجوا دیں۔ میں جلد ہی آپ کا کرجہ (قرض) اتار دوں گی۔ میں کھلنا کے ایک چھوٹے سے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"
لڑکی ہندی لہجے میں اردو بولتی ہوئی بہت ہی اچھی لگ رہی تھی۔ نقاہت کے باوجود اس کی کوشش تھی کہ منہاج حسین کی بیگم کو مطمئن کر دے۔ لڑکی اپنے دیش جانے کے لیے کس قدر بے چین تھی کہ بلا سوچے سمجھے ان سے دیش بھجوانے کے لیے کہہ دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ یہاں تو لوگوں کو بیمار رشتہ داروں کی عیادت کی فرصت نہیں کہ کسی اجنبی لڑکی کو پناہ دینا۔ اس کی رام کہانی سننا پھر پلے سے خرچ کر کے اسے ٹھکانے پر پہنچانا کس کو اتنی فرصتیں۔
ساجدہ کھانا لے آئی۔ تام چینی کے پرانے برتن تھے۔ ایک انتہائی استعمال شدہ اسٹیل کا چمچہ۔ ماں نے ساجدہ کو دیکھا۔ مگر ساجدہ نے ماں کی نظروں سے بچ کر ٹرے لڑکی کے آگے رکھ دی۔ منہاج حسین کی بیگم اس خیال سے کہ وہ اچھی طرح کھا لے، وہاں سے اٹھ آئیں اور سجو کو بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔
"برتن تو ڈھنگ کے لیتیں۔" انہوں نے خفگی سے کہا۔
"امی جی! وہ ہندو ہے۔" سجو نے بیزاری سے کہا۔
"تو پھر بھی بیٹا! اچھا نہیں لگتا کہ اس قدر بدرنگ برتنوں میں کھانا کھلایا جائے۔ کیا سوچے گی۔"
"کیا سوچیں گی محترمہ۔ ہم نے کونسا رشتہ داری قائم کرنا ہے۔" حماد آکر مخل ہوا۔
"نہیں بیٹے! صورت شکل سے اچھے گھر کی لگتی ہے۔ وقت بڑا بے رحم ہے۔"
"بس تائی اماں! چلا کریں۔ ان عورتوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کچھ نہ کچھ لے کر چلتی بنے۔ پھر دیکھتے رہ جائیے گا۔ اور سجو! جاؤ۔ تم اس کے ساتھ بیٹھو۔ اس طرح اسے تنہا مت چھوڑو۔ پھر رونا سر پکڑ کے۔" حماد پر تو اس کی معصوم صورت کا مطلق اثر نہ تھا۔
ساجدہ کمرے میں داخل ہونے کے بجائے اسے کھڑکی سے دیکھتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ کھانا کھا رہی تھی۔ اس کے کھانے کے انداز سے تہذیب کا پتہ چلتا تھا۔ اس نے کھانا ختم کر کے ٹرے ایک طرف رکھ دی۔ پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر اسی طرح بیٹھی رہی۔ تب ساجدہ اندر چلی آئی۔ اس نے ساجدہ کو دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
ساجدہ نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وقت کے ظلم کے طمانچوں کے نشان اس کے چہرے پر پڑے تھے۔
"سنو! تمہارے گھر والے مجھے نکال تو نہیں دیں گے؟" اس نے ساجدہ سے اپنے مخصوص ہندی لہجے میں پوچھا۔ ساجدہ کا حساس دل دکھ گیا۔ اسے بے انتہا ترس آگیا۔
"ارے نہیں۔ ہمارے ہاں کوئی زخمی بلی بھی آجاتی ہے تو ہم اس کی بھی مرہم پٹی کر دیتے ہیں۔ اور آپ تو ہمارے جیسی

محمود خاور کی لکھی ہوئی بچوں کی
سلیمان سیریز کے
2 نئے ناول
ننھے شیطان
اور
اُس کو نہیں چھوڑوں گا
شائع ہو گئے ہیں
مکتبہ عمران ڈائجسٹ ۳۷ - اردو بازار، کراچی

انسان ہیں۔" وہ اپنی باتیں کرنے لگی۔

منہاج حسین کی بیگم صبیحہ بیگم اپنے شسر کے کمرے میں چلی آئیں۔ منہاج حسین بھی وہیں تھے۔

"آبا میاں! میں نے اسے کھانا کھلا دیا ہے۔ اب اسے کس طرح جانے کو کہوں۔ آپ کہہ دیجئے۔"

انہوں نے صبیحہ بیگم کو بغور دیکھا۔ پھر بیٹے کی طرف رُخ کر کے بولے۔

"کیا اتنی گہری شام میں تم ساجدہ کو تنہا بھیج سکتے ہو؟"

"دُلہن! بہت افسوس کا مقام ہے۔ اس قدر خدا نے دیا ہے۔ ہر شئے ضرورت سے زیادہ۔ اور۔"

"آبا میاں! بات یہ نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ یہ ہے کہ کہ ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔ لڑکی جوان ہے۔ اور بہت خوبصورت ہے۔"

"ٹھیک ہے اسے یہ رات گزارنے دو۔ صبح دیکھیں گے۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا۔ پھر انہوں نے سر پر سے ٹوپی اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھی اور دراز ہو گئے۔

صبیحہ بیگم نے شوہر کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے جو آبا میاں کی مرضی۔ اور یہ بھی ایک انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے کہ ہم اسے پناہ دے سکتے ہیں مگر خود ساختہ واہموں میں گھر کر جو غلط بھی ہو سکتے ہیں کہ لڑکی کو نکال باہر کریں۔" منہاج حسین نے آہستہ سے کہا۔

ساجدہ تو بیس منٹ میں ہی اس سے بے پناہ متاثر ہو گئی۔ اس کے ڈھول۔ بنی سے اُٹے وجود کو دیکھ کر بولی۔

"آپ نہا لیں۔ میں امی کی کوئی ساڑھی لے کر آتی ہوں۔"

وہ بھاگ کر ایک مہین ریشمی ساڑھی لے آئی۔

لڑکی بہت خوف زدہ سی تھی۔ مگر ساجدہ نے زبردستی کھڑا کر دیا۔ اور باتھ روم میں لے گئی۔ خود باہر بیٹھ کر اس کا پاسپورٹ دیکھنے لگی۔ انگریزی اور بنگلہ میں کوائف تھے۔

نام ــــ سُندری وکاش۔

ولدیت ــــ وکاش رائے۔

تاریخ پیدائش ــــ ۵۷-۳-۷، راج گڑھی ہندوستان۔

قد ــــ ۵ فٹ ۳ انچ۔

جائے رہائش ــــ موہن داس۔ ۸۔ بھوز نگر۔ کھلنا۔

حمّاد نے کمرے میں آکر دیکھا۔ ساجدہ پاسپورٹ کے مطالعے میں مصروف تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔

"لگتا ہے کچھ زیادہ ہی سر چڑھا لیا ہے۔ ارے، تم لوگوں کو کچھ ہوش ہے کہ نہیں۔ ایک اجنبی انجان عورت کو کیا ٹھاٹ سے مہمان بنا لیا ہے۔ مجھ سے تو پڑھا بھی نہیں جا رہا کہ تمہاری لاپرواہی کے سبب کچھ ہو نہ جائے۔" وہ چڑ کر بولا۔

"سبحان اللہ کیا خاتون خانہ جیسے خدشے ہیں ــــ اطلاعاً عرض ہے گھر کے بڑوں کی آنکھوں پر پٹی نہیں بندھی ہے۔ آخر انسان کو پرکھ پہچان تو ہوتی ہے۔ بہت سادہ سی ہے بے چاری۔ جاؤ تم۔"

"اور تم نے بیا سے نہیں کرنی یہ اُلٹی سیدھی باتیں۔ انہیں تمہاری عقل پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ ہے۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"اور تم بھی سنو۔ تم ان محترمہ کو لے کر اپنے کمرے میں آ منتقل ہو جاؤ۔ بابا شاید آج آجائیں گے۔" وہ باتھ روم کے دروازے پر نگاہ ڈال کر پلٹتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"کوئی نہیں سو رہا یہاں تمہارے بابا کے کمرے میں۔ بے فکر رہو۔ آئے ہیں ہم۔" وہ بھی پھنکاری۔

ساجدہ نے اس کے بال سکھانے سلجھانے میں مدد کی۔

وہ نہا کر اس قدر نکھر گئی تھی اور اس قدر معصوم و پیاری لگ رہی تھی کہ ساجدہ کو اپنے اور حمّاد کے گزشتہ خیالات پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔

ساجدہ نے پاسپورٹ اس کے تھیلے میں ڈال دیا۔ اور کسی کام سے باہر آگئی۔

دس منٹ کے بعد واپس آئی تو وہ دروازے کی جانب۔ پُشت کیے ایک دم غافل سو رہی تھی۔ اس کے سیاہ گھنیرے بال بیڈ کے کافی حصے پر پھیلے ہوئے تھے۔

سوئے ہوئے چہرے پر ایک سکون سا طاری تھا۔

"پیدل آئی ہوں۔" ساجدہ کے کانوں میں اس کی آواز گونجی۔ اسے بے انتہا ترس آگیا۔ تھک کر چُور ہو گئی ہوگی۔

"خدا معلوم بے چاری پر کیا گزری ہے۔ ہم جیسے ٹھنڈے چھاؤں میں وقت گزارنے والے بھلا کیوں کر ان کے دکھ کا احساس کر سکتے ہیں۔"

حمّاد کہتا ہے کہ آپ پر نظر رکھوں۔ آپ پر تو خدا نے نظر رکھی ہے جب ہی تو آپ کو خدا نے ہمارا در دکھایا ہے۔ چہرے جھوٹ بولتے ہیں نگاہ ہمیشہ سچی ہوتی ہے۔ ہمارے دادا جان بہت اعلیٰ انسان ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو شاید امی کبھی اجنبی لڑکی کو پناہ دینے پر رضامند نہ ہوتیں۔ آپ کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔ سچی۔ پاکیزہ۔ آپ پر شک کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ حمّاد غالباً نفسیاتی مریض ہے۔ اسے ہر ایک مشکوک نظر آتا ہے۔

اٹھارہ سالہ آندھی طوفان کی طرح بڑھتی حسّاس سی ساجدہ اس کے ملیح چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے پشیمانی ہو رہی تھی کہ اس نے بھگوان کا مذاق اڑا کر کہیں اس کا دل نہ دُکھایا ہو کہ ہر شخص مذہب کے معاملے میں بے انتہا حسّاس اور جذباتی ہوتا ہے۔ اور دل آزاری سے بُرا کوئی دُکھتا احساس نہیں۔ "اللہ میاں مجھے معاف کر دینا۔" اس نے کانوں کی لَوؤں کو چھوا۔

اسی دم صبیحہ بھی اندر آگئیں۔

"امی! یہ سو گئیں ــــ کیا کروں؟"

"سونے دو۔ وہ ہاجرہ تو کل تک لوٹیں گے۔" کمرے میں فرنیچر کتابوں اور وال کلاک کے سوا کوئی خاص چیز نہ تھی۔ انہوں نے جائزہ لیا۔ "زمانہ ہی ایسا ہے کہ لوگوں نے بھیس بدل بدل کر اچھے بھلے لوگوں کا بھی اعتبار خراب کر دیا ہے۔" انہوں نے تاسف سے سوچا۔

وہ بیٹی کو لے کر باہر آگئیں۔ حمّاد کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ شاید وہ پڑھ رہا تھا۔ ساجدہ لیٹنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کچن میں آئیں۔ خانساماں کوارٹر میں جا چکا تھا۔ اس کی بیوی برتن دھونے کے لیے سنک میں جمع کر رہی تھی۔

"ہاجرہ! آج بہت دیر لگا دی برتن دھونے میں۔"

"جی، میں ننھے کو سُلا رہی تھی۔"

"اچھا، برتن دھو کر کچن بند کر دینا۔ دودھ فریج میں رکھ دیا؟"

"جی۔"

"اچھا، جب کام ختم کر لو تو مجھے بتا کر جانا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں ہوں۔ تمہارے صاحب سو رہے ہیں آہستہ دستک دینا۔ ہوں۔"

"جی۔"

وہ ساجدہ کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر اوپر چلی آئیں۔

ہے میرے مزاجِ زیست کو کیا کیا دیا گیا
صبر و قرار، حوصلہ اونچا دیا گیا

ہاجرہ پہلے زینے پر ہی تھی کہ کال بیل دُور سے آتی جرس کی آواز میں بج اٹھی۔ وہ باہر آئی، سامنے منہاج حسین تھے۔ انہیں لانے والی ٹیکسی واپس پلٹ رہی تھی۔

"سلام صاحب!" اس نے مؤدبانہ کہا۔

"وعلیکم السلام بھئی، ابھی تک تمہاری چھٹی نہیں ہوئی۔"

"برتن دھو رہی تھی جی۔" اس نے بیگ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"باقی سب لوگ؟"

"سو رہے ہیں۔ کھانا کھائیں گے صاحب؟"

"نہیں بھئی، کھانا تو نہیں کھاؤں گا۔ جہاز میں کھا لیا تھا۔ ہاں ایک کپ چائے بنا لو۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔"

دروازے کے پاس پہنچ کر انہوں نے ہاجرہ سے بیگ لے لیا۔

اپنے کمرے میں نائٹ بلب جلا دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ اندر داخل ہو کر انہوں نے پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ "کیا ساجدہ سو رہی ہے؟" وہ اُلجھن میں تھے۔

وہ ویسے ہی بہت لیے دیے رہنے والے مزاج کے حامل تھے۔ مگر ٹیوب آن کر کے وہ اپنے بیڈ کے نزدیک آئے۔ کوئی بے حد حسین لڑکی تھی۔ انہوں نے بردباری سے اس پر نگاہ ڈالی۔ "شاید بھابی کی کوئی رشتہ دار ہے۔ آسیہ، نغمہ، حنا، عالیہ، در دانہ میں سے تو کوئی نہیں ہے۔"

انہوں نے بہنوں کی لڑکیوں کا تصور کر کے اسے پہچاننے کی کوشش کی مگر ان میں سے کوئی بھی نہیں تھی۔ بالکل ہی اجنبی انداز۔ "چوبیس پچیس برس کی جب کہ ان کی بہنوں کی لڑکیاں ابھی کافی چھوٹی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ انیس بیس برس کی۔ آخر اس گھر میں اور بھی تو بہت سے کمرے ہیں۔"

"اے بی بی!" انہوں نے انتہائی لاتعلقی سے آواز دی۔ مگر وہ گہری نیند میں تھی انہوں نے اس کے شانے پر انگلی سے دستک دی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اور ایک بردبار سے مرد کو دیکھ کر یکلخت اٹھ بیٹھی۔ جو اس سے انتہائی رکھائی سے گویا ہوا تھا۔

"سنو بی بی! یہ میرا کمرہ ہے۔ غالباً تم یہاں غلطی سے لیٹ گئی ہو۔ ملازمہ آرہی ہے۔ ابھی تم باہر جاؤ۔ وہ تمہیں کوئی اور کمرہ دکھا دے گی۔"

بے حد لاتعلق سا انداز مروت نام کی کوئی شے ان کے پاس نظر نہ آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا یہ شخص ہر احساس سے عاری

ہے۔ لحاظ و مروت کے نام سے ناواقف ورنہ ایک سوئے ہوئے آدمی کو کون اتنی سرد مہری سے کہتا ہے۔ باہر جاؤ۔ کوئی اجنبی ہو تو پوچھ لیا جاتا ہے کہ آپ کون صاحب یا صاحبہ ہیں۔

وہ لرزتی ہوئی بغیر سلیپر کے باہر نکل آئی۔ اسے تو اس گھر کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں کچن ہے کہاں فلاں کمرہ۔ وہ تو جب سے آئی تھی اسی کمرے میں تھی۔

وہ کاریڈور کی ٹھنڈی دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔ کمرے سے چھن چھن کر آنے والی روشنی میں اس کا سایہ دیوار پر پڑ رہا تھا۔

حماد اپنی کھڑکی بند کرنے کے لیے پردے ایک طرف ہٹا رہا تھا کہ اس کی نگاہ کاریڈور میں کھڑے ہوئے شخص پر جا پڑی۔

"اوہ خدایا! یہ تو وہی ہے۔" سایہ میں جو وجود ابھر رہا تھا وہ ساڑھی میں ملبوس دکھائی دیتا تھا۔

وہ لمبے قدموں سے باہر آیا۔ اوپر تائی اماں کے کمرے میں پہنچا۔ دستک دی۔ وہ سمجھیں ہاجرہ آئی ہے۔ بولیں۔

"ٹھیک ہے، جاؤ۔"

"تائی اماں! میں ہوں حماد۔ وہ لڑکی بھاگ رہی ہے جلدی آجائیں۔"

"ہائیں!" وہ ہانپتی کانپتی باہر نکل آئیں۔ "کیا ہانک رہے ہو؟" وہ جھلائیں۔ منہاج حسین بھی آنکھیں ملتے ہوئے ان کے پیچھے چلے آئے۔

"یہ دردِ سر ابا میاں نے مول لیا تھا۔ ذرا انہیں بھی بتا دو۔" وہ بولے۔

اور ابا میاں کے کمرے پر دستک دی۔ "ابا میاں! ابا میاں!"

"ہوں بھئی۔" ان کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ اور چند لمحوں بعد دروازہ کھول دیا۔ تینوں چاروں نیچے پہنچے تو وہ بیٹھ چکی تھی۔ ملازمہ ڈرائنگ ہال کی سیڑھیاں چڑھ کر صبیحہ بیگم سے اس کے کمرے کے بارے میں پوچھنے گئی تھی۔ وہ لوگ باہر کے زینے سے اتر آئے تھے۔ اوپر ہاجرہ دستک پر دستک دے کر بیگم صیبہ! بیگم صیبہ!" کر رہی تھی۔ ایک لمحے میں سارا گھر وہاج حسین کے کمرے کے سامنے کھڑا اس کانپتی لرزتی سی جان کو نظروں سے ٹٹول رہا تھا۔

"دادا جان! دیکھا میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔ اگر محترمہ تھکی ہاری ہوتیں تو گھوڑے بیچ کر سوتیں نہ کہ آدھی رات کو گھر کی سیر کرتیں۔" حماد نے زہریلی نظروں سے اُسے دیکھ کر کہا۔

دادا جان کچھ بولنے کو تھے کہ شور کی آواز سن کر وہاج حسین باہر نکل آئے۔

"ہائیں!" سب ہونق سے ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگے۔ جیسے ان کے وجود پر شبہ ہو۔ وہ الگ سارے گھر کے ممبران کو اپنی دہلیز پر کھڑا دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

ملازمہ نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ سب جمع ہیں کوئی خاص بات ہے۔ وہ ساجدہ کو بھی جگا کر آ گئی تھی۔

"بی بی! جانے کیا ہو گیا ہے۔ باہر آ کر دیکھیں۔" ساجدہ کا دل خدشوں سے دھڑکنے لگا۔ وہ بھی تیزی سے چلی آئی۔ ادھر وہاج سے تمام ماجرا سن کر سب بُری طرح کھسیانے ہوئے تھے۔ اور گھر کے مالک و مکین ہوتے ہوئے بھی اس اجنبی لڑکی کے سامنے بے اندازہ شرمندہ تھے۔

"کسی کو نظروں سے گرانے کی حد ہوتی ہے۔"

غالباً یہ حماد کہہ رہا تھا۔ ابا میاں کہ بے چاری کھڑی ہوئی ہے۔ اسے میں نے کہا نہ معلوم کیا بات ہے۔ "وہ کھسیانی ہوئی بولیں۔ انہیں حماد پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا۔

ساجدہ نے کاریڈور کی لائٹ آن کر دی۔ سُندری کے رخساروں پر آنسو رواں تھے۔ سب کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ بیٹھ گئی اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سب گھبرا گئے۔ دادا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کیوں روتی ہو بٹیا؟"

اس نے آنسو بھری نظریں اٹھا کر حماد کو دیکھا۔ "اگر میں چور اچکی ہوتی تو بارہ تیرہ گھنٹے بھوکی پیاسی نہ رہتی۔ آپ کو اعتبار نہیں تھا تو بندی ہوتی پناہ۔ میں کسی گاڑی کے نیچے آ جاتی یا بھوک پیاس سے نڈھال ہو کر مر جاتی بھگوان کی سوگند میں بڑے اچھے گھر کی کنیا ہوں۔ میں بھیک بھی نہیں مانگ سکتی پیٹ بھرنے کو۔ میری صورت بھکارنوں جیسی نہیں۔ میں اچھے گھر کی ہوں۔ مجھ سے ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا۔ خدا کسی کے کرم ایسے نہ بنائے۔ جیسے میرے بنائے۔ بہت بُرے کرم ہیں میرے۔ مجھے آج کی رات کی سزا اور دے دو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔ وہاج حسین۔ بھگوان — سوگند — کنیا — کرم سن کر بڑے حواس باختہ ہو رہے تھے۔

صبیحہ بیگم نے محبت سے اٹھایا۔ "بیٹی! آج کل یہاں اس قدر ڈاکے پڑتے ہیں اور چوریاں ہوتی ہیں کہ لوگ بہت محتاط رہتے ہیں۔ کمبختوں نے ہمدردی کے مستحق لوگوں کی جان بھی عذاب کر دی ہے۔ چلو منہ ہاتھ دھو لو۔ جاؤ ساجدہ اسے ساتھ سُلا لو۔"

اور حماد حد سے زیادہ شرمندہ اور کھسیایا ہوا تھا۔ بہت سنجیدہ ذہین اور ذمہ دار لڑکا تھا۔ اسی ذمہ داری میں اس سے دل آزاری کی بھول چوک ہو گئی تھی۔

وہاج حسین نے ابا میاں سے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

"ایک ہندو لڑکی ہے۔ بے چاری کا کوئی نہیں۔ بنگلہ دیش سے اپنی پھوپھی کے ساتھ رشتہ داروں سے ملنے آئی تھی۔ پھوپھی بے چاری کا انتقال ہو گیا۔ دوسری پھوپھی اندھی ہیں۔ اس کا لڑکا — اس سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے۔ نشے کا عادی ہے۔ بچی گھر چھوڑ کر آ گئی۔ بس جتنی عمر اتنی مجبور۔ بھوکی پیاسی بُرے حالوں میں آئی تھی۔ بس ہم نے چھت دے دی۔ خدا نے اتنی بڑی چھت دی ہے۔ یہ اپنا دیا ہے۔ کیا ہم کسی مجبور و بے بس کو اس کا ذرا سا سایہ بھی نہیں دے سکتے! ایسی حالت میں تو کوئی جانور بھی آئے تو اس کا بھی احساس ہو جاتا ہے۔ یہ تو بھولی سی لڑکی ہے، بچی ہے۔" ابا میاں نے بیٹے کو سمجھایا۔

"اچھا ہے ابا میاں! ملازم رکھ لیں۔" انہوں نے گویا دادرسی کی۔

"کہتی ہے بہت اچھے گھرانے کی ہے۔ ہم اسے یہ بات تو نہیں کہہ سکتے۔ دفتروں، اسکولوں میں کام کرنا اور بات ہے۔ گھر میں ملازم رکھنا اور بات ہے۔ بہت خوددار لگتی ہے۔"

"کیا چاہتی ہے پھر؟" انہوں نے سادہ سے انداز میں پوچھا۔

"اپنے دیش جانا چاہتی ہے۔" ابا میاں نے جواب دیا۔ منہاج حسین جا چکے تھے۔ صبیحہ کھڑی تھی۔

"تم کب آئے وہاج! ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی میں اپنے کمرے میں گئی تھی۔"

"ہاں بابا! مجھے تو پتہ ہی نہ چلا آپ کب آئے؟" حماد نے بھی کہا۔

"ارے بھئی، ویسے تو تم بڑے چوکس ہو۔ بیل بجائی تھی باقاعدہ۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔

حماد جھینپ گیا۔ "اس بیل کی آواز بہت کم ہے۔"

اس نے یہ کہہ کر جھینپ مٹائی۔

ساجدہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ وہ اب بھی روتے ہوئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ ساجدہ اسے سونے کا کہہ کر لیٹ گئی۔

وہ بیڈ کے ایک کونے پر ٹکی ہوئی تھی۔

خدا معلوم ساجدہ کو اس سے اس قدر اجنبیت کیوں محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ جتنا کہ ہونا چاہیے تھی۔

سارا دن کی ہنستی کھیلتی ساجدہ لمحوں میں غافل تھی۔

وہ بہت دیر تک گھٹ گھٹ کر روتی رہی اور اس گھر کے بزرگ کو دعائیں دیتی رہی۔ جو اس کی مدد پر آمادہ نہ ہوتے تو کہاں جاتی۔ وہ تو گھر سے چلی تھی بے خبر انداز میں، صرف اپنے بچاؤ کا احساس تھا۔ مگر کراچی پہنچ کر اس نے ارادہ کر لیا۔ وہ یہاں کی "سرکار" (حکومت) کے کسی بڑے سے مل کر مدد کے لیے کہے گی۔

اس کی سہیلی ایک سال قبل یہاں سے ہو کر گئی تھی۔ شوبھا کہہ رہی تھی یہاں کی جنتا (عوام) بہت امیر ہے۔ اور اتفاق سے وہ کراچی کے اس متمول علاقے میں آ گئی تھی۔

اس نے پانی کے ایک گلاس کے لیے کتنے دروازے بجائے مگر وہاں سے برآمد ہونے والے مردوں نے کچھ اس انداز میں جائزہ لیا کہ وہ منہ سے آواز نکالے بنا آگے بڑھ گئی۔

یا پھر موٹی موٹی مونچھوں والے چوکیداروں نے خونی نظروں سے گھور کر پوچھا تھا۔

"کارٹ (کارڈ) لے ہے؟"

اور وہ دم سادھے آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ امیر جنتا کے درمیان پیاسی پھر رہی تھی۔ اس طرح بھکارنوں کی مانند کبھی گلی گلی پھرنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ اور کس قدر ذلیل و خوار ہو رہی تھی۔ حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اور پاؤں میں چھالے۔

وہ ان عالیشان عمارتوں کے بیچ پانی کی خاطر اس طرح پھر رہی تھی گویا شیروں کی نگری میں کوئی بھیڑ گھس آئی ہو۔

ادھر ادھر کوئی نل بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگر نظر آ بھی جاتا تو شاید اسے معلوم نہ تھا۔ اس امیر جنتا کے سرکاری نلکوں سے صرف ہوا خارج ہوتی ہے۔

تب ہی اس نے دیکھا تھا کہ سامنے سیاہ اور سنہری پٹیوں والے گیٹ پر ایک بیگم صاحبہ سبزی والے سے ٹماٹر خرید رہی تھیں۔ ان کی ملازمہ باسکٹ اٹھائے کھڑی تھی اور زیادہ

قریب آنے پر دیکھا۔ ایک سفید داڑھی (جو بہت نفاست سے ترشی ہوئی تھی۔) والے بزرگ ناک پر عینک ٹکائے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جن کی چھت تلے اسے امن کا احساس ہو رہا تھا۔ سب لوگ بہت اچھے تھے۔ مگر اسے اس لڑکے سے بہت خوف معلوم ہوتا تھا جو اسے اس طرح دیکھتا تھا۔ جیسے کچھ پا کر ہی دم لے گا۔

اور وہ آدمی جس نے اسے انتہائی بدلحاظی سے نکال باہر کیا۔ بڑے دماغ والا لگتا ہے مجھے کیا پتہ نہیں یہ لوگ مجھے دیش بھیجنے کے لیے میری مدد کریں گے یا نہیں۔

آہ! میری پیاری پشی ماں — اب میں اس گھر میں تنہا رہا کروں گی۔ وہ چھوٹا سا گھر درختوں میں گھرا ہوا۔ بڑے بڑے ناریل کے درخت۔ اس گھر کا ایک کمرہ صاف ستھرا۔ سامنے چھوٹا سا رسوئی گھر (باورچی خانہ) آگے گھاس پھونس کا ٹھنڈا چھپر۔ کیا میں اکیلی رہ لوں گی؟

مجھے اکیلا تو رہنا ہی ہے۔ بھگوان نے مجھے اکیلا پیدا کیا ہے۔ اکیلے رہنے کے لیے۔

بھگوان اگلے جنم میں مجھے ایک چھوٹی سی چڑیا بنانا۔ وہ یہ دعا بہت عرصے سے مانگتی تھی۔

پشی ماں کے کمرے میں دیوی کا مجسمہ تھا جہاں وہ آرتی اتارتی تھیں لوبان۔ اگربتی سلگاتیں اور آنکھیں بند کر کے دھونی رماتی تھیں۔ کیسا پریم تھا انہیں اپنے دھرم سے۔ انہیں میرے بیاہ کی کتنی چنتا تھی۔ وہ بڑا بکس جو ہم سونیا کے ہاں رکھوا کر آئے تھے۔ اس میں میرے لیے کتنے پیارے پیارے کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔ خوبصورت ساڑھیاں۔ مسلمان دستکاروں کے نمونوں کا شاہکار ساڑھیاں — بستروں کی چادریں، ریشمی۔ خوبصورت۔

وہ چھوٹا سا اسکول جہاں بنگالی۔ کالے بچے پڑھتے ہیں۔

وہ دیش کے خیالوں میں گم جانے کب نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

صبح دس بجے اس کی آنکھ کھلی۔ صبیحہ بیگم نے بیٹی کو منع کر دیا تھا کہ نہ جگائے۔ خدا معلوم کب سوئی ہو۔ انہیں رات کا منظر یاد کر کے ندامت سی ہو رہی تھی۔

وہ اٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ دیوی کا تصور کر کے کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

جب باہر آئی تو کافی ساری خواتین صبیحہ بیگم کو گھیرے بیٹھی تھیں۔

اسے دیکھ کر سکوت چھا گیا۔ پوری نیند لینے کی وجہ سے چہرے پر تازگی سی ابھر آئی تھی۔ خوبصورت خوابیدہ آنکھیں مہین گلابی ساڑھی جو اس نے شانوں اور سینے پر اچھی طرح لپیٹی ہوئی تھی۔ کھلے ہوئے بال، بے اندازہ حسین حسنِ بنگال کی ایک دلکش علامت۔

وہ سب چپ ہو گئیں۔ گویا وہ بھی کوئی مصر کے بازار کا آئیٹم تھا۔ یا وہ یوسف بن گئی تھی۔ اور وہ سب مصر کی عجیب مجوادر بہتان طراز عورتیں۔

پیچھے کھڑی ساجدہ نے شرارت سے سوچا۔ ان کے ہاتھ میں بھی چھریاں تھما دیتی تو مزہ آ جاتا۔

"یہ ہے — وہ — بھابی بیگم؟" آخر ایک خاتون نے سکوت توڑا۔

"ہوں۔"

چھوٹی پھپھو علین اسی وقت داخل ہوئیں اور سلام و جواب کے بعد عجلت سے مخاطب ہوئیں۔

"ہائے بھابی بیگم! سنا ہے آپ نے گھر میں ایک ہندو لڑکی رکھی ہوئی ہے؟ ہائے ابا میاں کہاں ہیں؟ کچھ بولے تو نہیں؟ میرے ابا میاں تو اتنے نمازی پرہیزگار۔ بھابی بیگم! آپ لوگوں کو ڈر نہیں لگا؟ خدانخواستہ کسی مصیبت میں پھنس گئے تو؟ مجھے تو صبح ہی صبح پتہ چلا۔ یہاں تک کا فاصلہ طے کرنا دوبھر ہو گیا۔ مجھے تو — اے ہائے لوگ کیا کہیں گے؟"

"کیوں — کیا ہم نے کسی کی بھینس کھول لی ہے؟"

کالج جاتے جاتے حماد نے شرارت سے ہنس کر پھپھو کو چھیڑا۔ ایسی حیران و پریشان خواتین کو دیکھ کر اسے بہت ہنسی آ رہی تھی۔

آج اس کا کالج جانے کا موڈ نہیں تھا۔ اہم پریکٹیکل کی وجہ سے جا رہا تھا۔ وہ بھی پھپھو کو بہت تنگ کر کے جو اسے گھر میں براجمان دیکھ کر بہت بل بھرتی تھی۔

"بیٹی حماد! بس تم کالج ریگولر جایا کرو۔ گھر میں بیٹھے دیکھ کر میری جان جلتی ہے۔ اور کوئی کام نہیں ہوتا ڈھنگ سے۔ جیسے۔"

اب بھی بہت تنگ کر کے پھر تیار ہوا تھا۔

"اے سلیمہ! ابا میاں نے ہی اسے رکھنے کو کہا ہے۔"

"ابا میاں نے! ایک ہندو لڑکی کو!" وہ حیران ہو کر چیخیں۔ تب صبیحہ بیگم نے انہیں ٹہوکا مار کر اشارہ کیا کہ وہ کھڑی ہے۔ مت چیخیں اس طرح۔

سب خواتین اس طرح دیکھ رہی تھیں گویا ملکہ وکٹوریہ کا بھاری مجسمہ لاہور میوزیم سے صبیحہ بیگم کے ہاں رکھ دیا گیا ہو۔ یا تو وہ اسے آنکھ کان سے پٹ سمجھ رہی تھیں یا واقعی کوئی مجسمہ بے اندازہ دل آزار باتیں مستقل کیے جا رہی تھیں۔ یہ اسے دیش کی برہمن زادیاں نظر آ رہی تھیں جو اسے اچھوت شودر کی طرح سمجھ کر اس کے سائے سے بھی متنفر نظر آ رہی تھیں۔ صبیحہ بیگم کے گھر والوں سے بالکل برعکس۔

"جاؤ ساجدہ! انہیں ناشتہ کراؤ۔" انہوں نے اسے وہاں سے ٹالنا چاہا۔

ساجدہ اسے لیے واپس اپنے کمرے میں چلی آئی اور وہیں اس کا ناشتہ بنا لائی۔

"ساجدہ! یہ لوگ کون ہیں؟" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ساجدہ کھلکھلا اٹھی۔ "ہم آپ پر ٹکٹ لگانے والے ہیں۔ سب دیکھنے آ رہے ہیں آپ کو۔"

"ساجدہ! کہیں تمہاری ماتاجی پریشان ہو کر مجھے—" اس نے ساجدہ کی سمت خوفزدہ انداز میں دیکھا۔

"ارے نہیں۔ میری امی ایسی نہیں ہیں۔" ساجدہ کے جملے میں پیار امڈ آیا۔ "اگر انہیں ایسا کرنا ہوتا تو وہ آپ کو گھر کے اندر بھی نہ بلاتیں۔ بہت اچھی ہیں میری امی، بڑا پیارا دل ہے ان کا۔ یہی مجھ سے کہہ رہی تھیں۔ رات سندری کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ دراصل ہمارے چچا جان اپنی فرم کے کسی کام سے دو دن کے لیے کوئٹہ گئے تھے۔ مگر ایک دن بعد ہی آ گئے۔ کام ہو گیا ہو گا۔ اس وجہ سے۔ بہت سخت مزاج ہیں۔ آپ کو تو کچھ نہیں کہہ دیا تھا؟ حماد کے ابو ہیں۔ وہی حماد جسے آپ دیکھ چکی ہیں۔ کچھ کہا تو نہیں آپ کو—؟"

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"سنیں۔ میں آپ کو کیا کہوں؟ آخر وطن جانے تک تو آپ یہاں رہیں گی نا—؟ آپ کو بلانا بھی پڑے گا۔ کہیے کیا کہوں؟" ساجدہ نے سادگی سے پوچھا۔

"دیدی کہہ لیا کرو۔" سندری نے آہستگی سے کہا۔

"آپ کو پتہ ہے کہ پاکستان میں "دیدی" نہیں، "باجی" چلتا ہے۔ باجی کہہ دیا کروں گی۔ ٹھیک ہے؟"

سندری کے ہونٹوں پر سہمی سہمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

؎ ترسا دیا ہے ابرِ گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی سمندر لگے مجھے

اسے آج یہاں تیسرا دن تھا۔ آج بھی وہ سویرے ہی اٹھ گئی تھی۔ وہ غسل کر کے جھجکتی ہوئی لان میں چلی آئی۔ اس کے کانوں میں ابا میاں کی آواز آئی۔ ابا میاں جو سورۃ الرحمٰن کی بلاناغہ تلاوت کرتے تھے۔ ان کے نزدیک اس سورۃ کی تلاوت کرنا دراصل شکرگزاری کا بہترین ذریعہ تھا۔ کتنا خوبصورت آہنگ ہے اس سورۃ میں۔ دل پانی پانی ہونے لگتا ہے۔

قرآن ایک معجزہ ہے! اور یہ اس معجزے میں ایک معجزہ۔

اس کا مطلب و مفہوم تو اس کی سمجھ میں نہ آیا مگر اسے وہ بے حد غیر معمولی لگا۔ وہ وہیں فوارے کے نزدیک بیٹھ گئی۔

قرآن بند کر کے ابا میاں عربی زبان میں بہت دلپذیر دعائیں مانگ رہے تھے۔ ان کی آواز گلوگیر تھی۔ وہ اسے سامنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

تمام گھر جاگ چکا تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

ہمیشہ کے معمول کی طرح ساجدہ نے مخصوص برتنوں میں ناشتہ کرایا۔

ساجدہ اسے ناشتہ سب سے پہلے کرا دیتی تھی۔ باقی افراد بڑی سی میز پر ناشتہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے سنا۔ ابا میاں کہہ رہے تھے۔

"بھئی! اسے بھی یہاں لے آیا کرو۔"

ساجدہ نے حماد کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ "وہ نہیں آئیں۔" حالانکہ اس سے کبھی کسی نے نہیں کہا تھا۔ وہ چپ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں بھی بات بہت کم کرتی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ ساجدہ کی آواز نے چونکا دیا۔

"سندری باجی! دادا جان بلا رہے ہیں آپ کو۔"

اس کا دل دھڑک گیا۔ "ک— کیوں؟"

"پتہ نہیں آئیں۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔" وہ اس کے ہمراہ کھانے کے کمرے میں چلی آئی۔ مگر بے اندازہ جھجک گئی۔ میز کے اردگرد تمام گھر موجود تھا۔

"آؤ بیٹی!" ابا میاں نے نہایت شفقت سے اسے بلایا۔ اور اپنے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ لرزتی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کے مقابل وہاج حسین اور ساجدہ تھے۔ دائیں جانب ابا میاں اور صبیحہ بیگم اور بائیں جانب منہاج حسین اور حماد۔

"بیٹی! بنگلہ دیش میں تمہارے رشتہ دار ہیں؟"

"نہیں۔ میری ماتا جی کی دو بہنیں جوان سے بہت بڑی تھیں۔ شادی سے پہلے سے لندن میں ہیں۔ میں نے انہیں صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ اپنی ماتا جی کی مرگ پہ۔"

"پھر تم کس کے پاس جاؤ گی؟" صبیحہ بیگم نے بھی سوال کیا۔

"میرا گھر ہے جی۔ میرا مطلب ہے میری اپنی ماں کا۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تو کیا اکیلی رہو گی؟"

"جی!"

"لیکن یہاں تو تم اکیلی رہ نہیں سکتیں تو وہاں کیسے رہو گی؟" ابا میاں نے اسے بغور دیکھا۔

"وہ میرا دیش ہے وہاں میری سکھیاں ہیں۔"

"جب سکھیوں کی شادی ہو جائے گی پھر؟" صبیحہ بیگم نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ اتنے سوالات کیوں کر رہے ہیں۔ اسے دیش بھجوانے کی بات کیوں نہیں کر رہے۔

"کیا تمہاری منگنی ہو چکی ہے؟" ابا میاں نے دریافت کیا اور وہ ابا میاں سے اس سوال کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔ بالکل گھریلو لڑکیوں کی طرح شرما کر رہ گئی۔

"جواب دو بٹیا!"

"نہیں۔" اس نے بدقت کہا۔

ساجدہ اور صبیحہ بیگم نے اس کے حسین مکھڑے اور دلکش سراپے کو دیکھ کر سوچا ایسے چاند چہرے کا ابھی تک کوئی طلب گار نہیں!

"ایک تجویز ہے اگر تم ہمیں ہمدرد سمجھتی ہو تو اس پر غور کرنا۔" ابا میاں نے بہو کی سمت دیکھا۔ وہ جلدی سے بولیں۔

"دیکھو سندری! ایک سوال کا جواب اور دے دو۔ پھر تم سے اہم بات کرنا ہے۔" اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"کیا تمہارے باپ تم سے ملتے ہیں؟"

"وہ میرے پتا جی کا جنم سدھار چکے ہیں۔ مجھے نہیں پتہ کہ اگلے جنم میں بھگوان نے انہیں کیا روپ دیا ہے۔" اس نے عجیب و غریب جواب دیا جو ساجدہ کے تو بالکل سر پر سے گزر گیا۔

"اچھا!" وہ خاموش سی ہو گئیں۔ تھوڑے توقف کے بعد گویا ہوئیں۔

"سندری! دیکھو تم ایک اکیلی لڑکی ہو۔ بالکل غیر محفوظ ابا میاں کا خیال ہے کہ ہم تمہاری شادی کسی اچھے سے آدمی سے کر دیں تاکہ تم بے فکر ہو کر ایک محفوظ زندگی گزارو۔ ابا میاں کہتے ہیں ہمارے رب نے ہمیں ایک نیکی کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہمارے مذہب میں کسی کنواری بے سہارا کا گھر بسا دینا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ کسی کی مدد کر کے اسے خوشی دے کر مسلمان ایک زندگی ــــ ایک روشنی پاتا ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رکیں۔

"مگر مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں غیر ملکی میمیں تو آسانی سے آجاتی ہیں مگر دیسی عیسائی اور ہندو لڑکیوں کو مسلمان کر کے بھی کوئی شادی پر رضامند نہیں ہوتا۔ ابا میاں کہتے ہیں کہ تم ہمارے فطری مذہب کا مطالعہ کرو۔ اگر تمہارے دل میں اتر جائے تو تم ہماری ہم مذہب بن جاؤ۔"

"دیکھو سندری بٹیا! یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ تم ہمارے گھر میں ہو تو ہم تم پر جبر کر رہے ہیں۔ زبردستی کر رہے ہیں۔ ہمارا مذہب کسی معاملے میں بھی زبردستی کا حامی نہیں۔ اب یہی دیکھ لو۔ مغلوں نے سارے ہندوستان پر حکومت کی مگر کسی پر مذہب کے معاملے میں زبردستی نہیں کی اگر زبردستی مسلمان بنایا جاتا تو مغل حکمرانوں کے دور میں کوئی ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی نظر نہ آتا۔ سارا ہندوستان مسلمان ہوتا۔

پاکستان بننے سے پہلے شاید تم پیدا بھی نہیں ہوئی ہوگی مگر میں تمہیں مسلمان حکمرانوں اور انگریز حکمرانوں کا فرق بتاتا ہوں۔ مسلمان تبلیغ ضرور کرتا ہے مگر زبردستی نہیں کرتا۔ مگر انگریز حکمرانوں کے دور میں مشن اسکولوں نے کس قدر عیسائیت کا پرچار کیا بلکہ ایک طرح سے زبردستی کا انداز اپنایا۔ مسلمانوں کو حقارت سے دیکھا۔ انہیں کمتر سمجھا۔ وہ اقتدار میں تھے۔ انہوں نے اعلیٰ پیمانے پر عیسائیت کی تبلیغ کی۔ جب کہ مسلمان خادم ہو یا حاکم مذہب کی تبلیغ ضرور کرتا ہے ــــ مگر زبردستی نہیں چاہے اقتدار میں ہو یا رعیت میں صرف تبلیغ کرتا ہے۔ اس کے لیے اقتدار کی ضرورت نہیں۔ کسی کو حقیر نہیں سمجھتا۔ ہم تمہیں دعوت ــــ دیتے ہیں۔ تم مذہب اسلام کا مطالعہ کرو۔ میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ اگر تمہارے

دل کو چھو جائے تو تم ہم میں سے ہو جاؤ ورنہ ہم کسی اچھے ہندو نوجوان سے تمہاری شادی کر دیں گے۔ بلکہ اگر تم راضی ہو تو ہم آج ہی اخبار میں اشتہار دے دیتے ہیں؟"

سندری دم سادھے ابا میاں کی باتیں سن رہی تھی۔

"تو پھر کیا کہتی ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"مگر میرے جانے میں بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں۔" اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہاں کی سرکار جیل میں ڈال دے گی مجھے۔"

سب مسکرا دیے۔

"اس کا بھی انتظام کر دیں گے۔ تم اتنی اچھی اور سادہ بچی ہو۔ تمہیں خوشیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔"

ابا میاں کی بات پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ہائے کیسی بھگوان کی مورت ہیں۔ ساجدہ کے دادا دیوی کے ہر روپ میں بھی جیون ایسا سپھل نہیں ہوتا۔ جیسا ان کی باتوں میں ہوتا ہے۔ یہ گھر گھر نہیں آشرم (عبادت خانہ) لگتا ہے۔ اور یہ ساجدہ کے دادا۔ ان کی آتما (روح) کو تو بھگوان کبھی نرگ جنم کی سزا نہیں دے گا۔ ان کا کشٹ بیکار نہیں جائے گا۔ ان کی آتما ہمیشہ سکھی رہے گی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" صبیحہ بیگم نے اسے ٹوکا۔

وہ چونک گئی۔ "کچھ نہیں۔ آپ سب ٹھیک کہتے ہیں۔"

منہاج حسین اٹھ کر جا چکے تھے۔ انہیں یہ سب پسند نہیں آیا تھا۔ آخر خواہ مخواہ کے جھمیلوں میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے؟ ابا میاں کو بڑھاپے کے یہ مشغلے سوجھے ہیں؟ ہندو، عیسائی لڑکیوں کو دسترخوان پر بٹھائیں گے مسلمان کریں گے پھر ان کی شادیاں کریں گے۔ ہونہہ۔"

"کیا ہم کسی ہندو نوجوان کے لیے اشتہار دے دیں؟" ابا میاں نے پوچھا۔

"ابھی نہیں میں سوچوں گی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

منہاج حسین اور حماد بڑی خاموشی سے ابا میاں اور سندری کا مکالمہ سن رہے تھے۔ بات ختم ہوتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساجدہ بھی سندری کو لے کر باہر آ گئی۔

انکار کس کا کرتے ہو تم وہ اگر نہیں؟
انکار جس کا کرتے ہو تم وہ خدا تو ہے!

پھر سندری عموماً ابا میاں کے پاس بیٹھی نظر آنے لگی۔ وہ اسلامی کتب کے اہم اقتباسات اسے سناتے یا پھر اپنے وجدان کے تجربات غیر محسوس انداز میں سنا جاتے۔

"بیٹا! مسلمان کا یقین ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ وہ ایک نور ہے، روشنی ہے۔ اس کے عزا... اس روشنی کے مخرج کا سراغ لگانا اگرچہ بہت مشکل بات ہے مگر اتنا مشکل بھی نہیں۔ تم صرف اور صرف اسے سوچنے بیٹھو تو وہ تمہیں اپنے قلب کے علاوہ روئیں روئیں، پور پور سے پھوٹتا دکھائی دے گا۔

بات یقین اور قوتِ ارادی کی ہے اگر انسان کی قوتِ ارادی اٹل ہو تو اس کی یقین کی طاقت بھی بہت مضبوط ہو گی۔ اگر وہ یقین کرے کہ اس پتھر سے پانی پھوٹ نکلے گا۔ تو واقعی پھوٹ نکلے گا۔

دیکھو تم ذی عقل و ہوش ہو۔ تم نے اپنے ہاتھوں سے پتھر کی مورتیاں تراشیں، سونے چاندی کی مورتیاں ڈھالیں پھر ان کے آگے سجدہ ریز ہوئے۔ کیا تمہاری عقل نہیں چونکتی کہ جو خود کو پیدا کرنے پر قادر نہیں وہ تمہاری بگڑی کیا بنائے گا؟

تم اپنے مذہب پر یقین کرتے ہو جب تم ان کے آگے جھک کر اٹل یقین سے کچھ چاہتے ہو اور پھر پا لیتے ہو تو اس میں اس پتھر کی مورتی کا دخل نہیں، بلکہ تمہاری قوتِ ارادی اور یقین کی پختگی کا دخل ہوتا ہے۔ یہ بے جان مورتی پہلو بدلنے پر بھی قادر نہیں بلکہ تمہاری محتاج ہے۔ تم جہاں چاہے اٹھا کر رکھ دو یا ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔

بیٹی! معاف کرنا اگر تمہیں برا لگے جب یہ مورتی نہیں ڈھالی گئی تھی۔ تب بھی کوئی عذاب نہیں اترا۔ اب تم اسے توڑ دو تو یہ بے جان مورتی تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے؟

دراصل رب العالمین نے یہ کھوج یعنی خدا کی کھوج انسان کی مٹی میں ملا دی ہے۔ جب وہ دنیا میں آتا ہے تو بے اختیار اسے ڈھونڈتا ہے۔ مدد چاہتا ہے۔ مگر رہنمائی صحیح نہیں مل پاتی وہ سورج کو دسترس سے دور سمجھ کر طاقت ور مان بیٹھتا ہے۔ آگ میں کود پڑنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ آگ اسے ڈراتی ہے۔ وہ اسے عظیم سمجھ لیتا ہے۔ اور اس کی پرستش کرتا ہے اور پارسی کہلاتا ہے۔"

ابا میاں بات کرتے کرتے جانے کہاں کھو جاتے ایک دم غافل اور سرور کے عالم میں عربی میں حمد پڑھنے لگتے سندری کی آنکھوں سے اچانک آنسو بہہ نکلتے۔ اس کا دل خواہ مخواہ بھر آتا۔ پاس بیٹھی ساجدہ بھی ٹھٹھک اٹھتی۔ ابا میاں کا

حکم تھا۔ وہ بھی ان کے پاس بیٹھے۔

؎ تُو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
دوسرا کون ہے جہاں تُو ہے!

رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ سب چاند دیکھنے چھت پر تھے۔ تمام نوکر گھر کے افراد، سندری کو آسمان کی وسعتوں میں نظر دوڑاتے ہوئے جانے کیوں خوف سا آرہا تھا۔ کافی دیر بعد شور اٹھا نظر آگیا ہے۔ چاند نظر آگیا، سب نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔ ساجدہ خوشی سے ماں سے لپٹ گئی۔

مسجدوں میں شور ہونے لگا سحری و افطار کے وقت کا اعلان، حمد و نعتیں۔

ذرا دیر میں فضا ایسی رونق افروز ہوگئی کہ اس کی کشش اور حسن سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

صبیحہ بیگم نوکروں کو خصوصی ہدایت دے رہی تھیں۔ سب نے عجب چہل پہل میں رات کا کھانا کھایا۔ پھر گھر کے تمام افراد مسجد چلے گئے۔ عورتیں یعنی ساجدہ، صبیحہ بیگم اور ان کی دو نوکرانیاں چھت پر چلی گئیں۔ آج انہوں نے بہت دیر تک نماز ادا کی۔

جب وہ لوگ فارغ ہوئیں تو اس نے آج اتنی دیر تک نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا۔

"ارے سُندری باجی۔ آج سے تراویح کی نماز بھی شروع ہوگئی ہے۔ نماز تراویح رمضان کی خصوصی عبادت ہے۔ اس مرتبہ ہماری بہت پرانی ملازمہ سردری بُوا نہیں ہیں۔ اپنے گاؤں میں ہیں۔ انہیں بہت سارا قرآن حفظ ہے ہم انہیں "امام" بنایا کرتے تھے۔"

یعنی آگے ہوتی تھیں، یعنی نوکر آگے مالک پیچھے۔ ہمارے ہاں تو نوکروں کو اپنے کمروں میں کسی جگہ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے دل پر بہت زیادہ اثر ہوا۔

وہ مغرب کی نماز کے بعد ابا میاں کی باتیں سن کر جانے کیوں بہت روئی تھی۔

ابا میاں نے اسے بتایا تھا۔ اب ان سے ملاقات عید سے ایک دن پہلے ہوگی۔ وہ پریشان ہوگئی تھی۔ تب انہوں نے بتایا۔ وہ مسجد میں معتکف ہورہے ہیں۔ پھر انہوں نے اسے اعتکاف کے بارے میں بتایا اور کہا۔

"بیٹی! ہم خوش نصیب لوگ ہیں۔ خدا نے دین حق پر کاربند رہنے والوں کے گھر ہم کو پیدا کیا۔ ہمیں اس مذہب میں پیدا کیا جو اصل اور فطری ہے۔ ہمیں خدا کو ڈھونڈنے کے لیے پتھروں اور آگ میں نہیں دیکھنا پڑا۔ ہم دینِ فطرت میں پیدا ہوئے۔ ہمارے کانوں نے پہلی آواز سنی جو یہ تھی۔ اللہ اکبر۔ لاالٰہ الا اللہ۔ یعنی خدا برتر ہے۔ ایک ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ ہمیں شعور دے کر خدا نے ہمیں ہمارے سینوں سے پکارا۔ "میں یہاں ہوں" وہ آبدیدہ ہوگئے۔

اور سندری کے قلب کی عجب کیفیت ہونے لگی۔ "میں یہاں ہوں" — "میں یہاں ہوں۔" وہ سوچنے لگی۔ اس مسلمانوں کی نگری میں، میں پیاسی پھر رہی جیسی باتیں ابا میاں کرتے ہیں۔ اور کوئی کیوں نہیں کرتا؟ اور لوگ ابا میاں جیسے کیوں نہیں۔ جتنی عبادت ابا میاں کرتے ہیں دوسرے کیوں نہیں کرتے۔

تب ابا میاں نے بتایا انسان میں دو زبردست طاقتیں ہیں۔ روح اور نفس۔ روح خدا کا نورانی پرتو ہے اور نفس شیطان کا محکوم۔ روح اپنے مخرج کی طرف بے اختیار کھینچتی ہے مگر نفس عیار ہے اور روح سادہ و معصوم۔ نفس اوچھے ہتھکنڈوں سے اسے زنجیر کرتا ہے۔ جس کے وجود میں نفس جیتتا ہے۔ یعنی ہم جیسے لوگوں میں۔

"نہیں ابا میاں۔ آپ جیسے نہیں اوروں جیسے۔" اس کے دل نے محبت بھرا احتجاج کیا۔ "ہم جیسے ابا میاں۔ ہم جیسے —"

ابا میاں کہہ رہے تھے۔ "جب نفس جیت جاتا ہے۔ تو روح اپنی شکست پر بہت روتی ہے اور نفس کا شکار انسان بے قرار رہتا ہے۔ اس کو چین کی نیند نہیں آتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خوف زدہ و پریشان کیوں ہے؟

لیکن جب روح جیت جاتی ہے تو انسان بے نیاز اور متوکل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ یہ بڑا مختصر عمل ہوتا ہے۔ روح ایک ذرا سا اپنے مخرج، منبع کی طرف بڑھتی ہے۔ یہ مخرج اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی نورانی آغوش میں سمیٹ لیتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں۔ یہاں کچھ نہیں ملتا۔ اور بات یہ ہے بیٹی! سب کچھ یہیں ملتا ہے۔"

ان کی آواز مدھم ہوگئی اور ان پر ہمیشہ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جانے کہاں کھو گئے تھے۔

اب ابا میاں مسجد جاچکے تھے۔ گھر ویران سا لگنے لگا تھا۔ اسے اس گھر کے ایک ایک کونے سے ان کی مہک آرہی تھی۔ وہ باغ میں آتی اور سنگی بنچ پر ہاتھ رکھ کر سوچتی ابا میاں یہاں بیٹھتے تھے۔ کمرے میں ان کے بستر پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیتی۔ ابا میاں یہاں سوتے تھے۔ پھر ان کے بستر سے اس طرح اٹھ جاتی گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہائے ان کا پوتر بستر۔" وہ جھینپ کر اس جگہ کو دیکھتی جہاں بیٹھ گئی تھی۔

ان کے کمرے کی دیواروں پر ہاتھ پھیرتی۔ ابا میاں کو چھو چھو کر ہوا کہاں کہاں ٹکرائی ہوگی۔

"اس طرح تو کبھی ماتا جی، پتی ماں بھی یاد نہیں آئی تھیں۔ کیسے کٹیں گے یہ دن؟"

اس نے پوچھا تھا۔ "ابا میاں! جب سب کو آپ کے اللہ نے پیدا کیا ہے اور وہ سب کے دلوں میں رہتا ہے۔ تو کیا میرے دل میں ہوگا؟"

"سب بندے اس کے ہیں بیٹی! جس طرح کسی شخص کی اولاد میں سے کچھ بہت فرمانبردار ہوتے ہیں اور کچھ سرکش و نافرمان۔ وہ تمہارے دل میں بھی رہتا ہے۔"

"ابا میاں آپ روز دستک دیتے تھے۔ روز میرے من کا کواڑ چرچراتا تھا۔ شاید کھل ہی جاتا۔ آپ چلے گئے۔ بھگ — بھگ نہیں — ال — اللہ کرے۔ آپ جلدی آجائیں۔"

اپنی قسمت کو رو رہے ہیں ہم!
آپ کا نام کون لیتا ہے

ابا میاں سب سے کہہ گئے تھے کہ سندری کا خیال رکھیں۔ اس کی دل جوئی کریں۔

اور سب اس کا بہت خیال رکھتے۔ ڈرتے ڈرتے وہ بھی چھوٹے موٹے کاموں میں لگ جاتی تھی۔ ساتھ ہی صبیحہ بیگم کی پیشانی بھی دکھتی جاتی تھی مگر وہ فراخ اور خندہ ہی نظر آتی تھی۔ فارغ اوقات میں اس نے ساجدہ کے کرتے اور قمیضوں پر بے حد خوبصورت کڑھائی کی تھی۔ جو سب کو بے حد پسند آئی تھی۔ ساجدہ نے اس کا بار بار شکریہ ادا کیا تھا۔

اور وہ خوبصورت، کھلنڈرا سا لڑکا حماد بھی اس سے بہت بے تکلف ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ شائستہ مذاق کرتا۔ وہ اس کی سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ سے بے حد متاثر ہوگیا تھا۔ وہ اس سے کافی بڑی تھی مگر جب بھی اس کا سامنا ہوتا۔ سر پر آنچل ڈالے رہتی۔

کئی بار وہ اپنے گذشتہ رویے پر معذرت بھی کرچکا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا۔ اس لڑکے کی — صورت کی طرح اس کا دل بھی خوبصورت ہے۔ وہ اس کا کمرہ صاف کردیتی اس کے لاڈ اٹھاتی۔ ہر بات میں اس کی حمایت کرتی۔ اس کے انداز میں بے پناہ شفقت تھی۔ وہ جب بھی بات کرتی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی بڑی بہن یا ماں ہو۔ ہر انسان لہجے کے متعلق بڑا حساس ہوتا ہے اور اس کا لہجہ حماد کے دل میں اتر جاتا۔

ساجدہ کو اس نے کئی مرتبہ گلے سے لگا کر پیار کرلیا تھا۔

وہ بنے انتہا صاف ستھری خوشبودار رہتی۔ اچھا کھانے پہننے کو مانتا تھا۔ سب سے بڑی بات کہ سکونِ قلب تھا۔ ساجدہ اور حماد بظاہر لڑتے جھگڑتے نظر آتے تھے مگر ان کے حسین جذبوں کی آنچ سندری بھی محسوس کرتی تھی۔ اسے بس ابا میاں کا انتظار رہتا تھا۔ گھر میں اگر اس سے حد درجہ کوئی لاتعلق تھا تو وہ وہاج حسین تھے۔

ساجدہ نے بتایا تھا، چچا جان کی شادی بہت کم عمری میں ہوگئی تھی۔ جب وہ بی ایس سی کے سال اول میں تھے۔ ان کی منگیتر ان کی قریبی کزن اور ابا میاں کی بہن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ بہن کے انتقال کے بعد وہ وہاج حسین کی منگیتر یعنی اپنی بھتیجی کو گھر لے آئے تو لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس طرح رکھنے کے بجائے بہتر ہے کہ ان سے نکاح کردیا جائے اور یوں ان کی شادی ہوگئی تھی۔

وہاج حسین بہت کم عمر تھے۔ انہیں بہت شرم آتی تھی۔ انہوں نے اس کا تذکرہ تک کالج میں نہیں کیا تھا۔ لیکن دو سال بعد جب وہ بی۔ ایس۔ سی کرچکے تھے تو ان کے ہاں بیٹا ہوچکا تھا۔ اس وقت وہ بائیس برس کے تھے۔ ابا میاں پوتے کی پیدائش پر بہت خوش ہوئے اپنی پسند سے حماد نام رکھا۔ ان کی خوشی کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ منہاج حسین اس وقت تک لاولد تھے۔ یوں وہ اس گھر کا پہلا پوتا تھا۔

انہوں نے ایک تقریب کا اہتمام کیا تو وہاج حسین

کے دوستوں نے بھی شرکت کی وہ ان سے سخت خفا ہوئے کہ اتنی بڑی بات پوشیدہ رکھی گئی۔ بہر حال اب سب خوش تھے۔

ٹھیک دو سال بعد ساجدہ پیدا ہوئی۔ اس کا نام بھی ابا میاں نے رکھا۔ منہاج حسین کوئی فیشن ایبل نام رکھنا چاہتے تھے۔ مگر باپ کی بات کو وہ بھی مقدم رکھتے تھے۔

ابا میاں نے کہا تھا۔

"منہاج بیٹا! میں نے بچی کا نام ساجدہ رکھا ہے عجیب سی چاشنی ہے اس نام میں، ساجدہ۔ یعنی سجدہ کرنے والی۔"

انہوں نے محبت سے پوتی کی پیشانی چوم لی تھی۔ لیکن ساجدہ کی پیدائش کے بعد ثریا چچی کا انتقال ہو گیا تھا اور پھر حماد کو بھی صبیحہ بیگم نے پالا تھا۔ وہ بھی انہیں ماں ہی سمجھتا تھا۔ اور ان سے بہت محبت کرتا تھا۔

ساجدہ نے یہ بھی بتایا چچی سے وہاج چچا کو بہت محبت تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے آج تک شادی نہیں کی۔ سب نے بہت زور دیا مگر ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔

سعدیہ پھوپھو کے بقول کم عمری میں کی گئی محبت کی چنگاری اندر ہی اندر راکھ ہوتے وجود میں سلگتی رہتی ہے۔ اگر بھڑکتی نہیں ہے تو بجھتی بھی نہیں ہے۔ یہ ساجدہ کی سب سے چھوٹی پھوپھی تھیں۔

تب اس نے پہلی مرتبہ اس سجے آدمی کو بغور دیکھا تھا۔ انتہائی طرح دار شخص۔ نک سک سے درست۔ تھوڑا تھوڑا سا خود پسند۔ خاموش خاموش سا۔ لاتعلق و سرد مہر سا۔ جس کی گمبھیرتا اور خود اعتمادی کے آگے اچھے سے اچھے شخص کی خود اعتمادی پانی ہو جاتی تھی۔

اس وقت وہ بیالیس سال کے تھے یا کچھ زیادہ کے لیکن رکھ رکھاؤ سے ایسے نظر آتے تھے گویا ایک دو ننھے منے بچوں کے باپ ہوں گے اور بس۔

اس دن وہ سب لان میں بیٹھے تھے۔ وہ پڑوس کے ایک خوبصورت شریر سے بچے کے ساتھ گھاس پر بیٹھی تھی کہ وہاج حسین اس سے مخاطب ہوئے۔

"ارے بھئی لڑکی! ابھی تک تمہاری شادی وادی نہیں ہوئی؟ اس دن تو ابا میاں تمہاری شادی کرا رہے تھے۔"

وہ اس طرز تخاطب پر پٹپٹا کر رہ گئی۔

پھر وہ اپنی بھابی کی طرف متوجہ ہوئے۔ "بھئی اس کی شادی وادی کا کیا ہوا؟ کرا دیں کہیں۔ اس طرح یہ یہاں کب تک رہے گی۔" ان کی آواز میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ بلکہ بڑا خشک سا انداز تھا۔

وہ ندامت کے ساتھ سُن سی بیٹھی رہ گئی۔ "شاید مجھے یہاں بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ انشاءاللہ عید بعد یہ اپنے گھر کی ہو گی۔" صبیحہ بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ طاؤسی ساڑھی اور کھلے کھلے گیلے بالوں میں وہ حساس لڑکی آنسو پینے کی کوشش میں نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچل رہی تھی۔ انہیں یقین تھا۔ اس قدر پیاری لڑکی کو کوئی نہ کوئی تو لے جائے گا۔

تب وہ وہاں سے اٹھ کر آ گئی اور آنسو بہاتے ہوئے سوچا تھا۔ "ابا میاں آپ جلدی آ جائیں۔" اس نے اتنی اپنائیت اور لاڈ سے سوچا تھا گویا وہ اس کے سگے باپ ہوں۔

ستاروں کی طرف اڑنے لگا ہوں لیکن
نظر سے تیز ہے رفتار میری

آج انتیسواں روزہ تھا۔ سب روزہ کھول کر چھت پر آ گئے۔ چاند نظر آ جانے پر اس گھر میں ہنگامے اتر آنے تھے۔ ابا میاں کی بیٹیاں، داماد، نواسے نواسیاں سب کو آ جانا تھا۔ ابا میاں نے آج گھر آ جانا تھا۔ نماز کے بعد۔

چاند نظر آ گیا تھا۔ دور دور سب لوگ اپنی اپنی چھتوں پر خوشی سے چیخ پڑے تھے۔

سب نماز سے فارغ ہو کر تیار ہو گئے۔ اس گھر میں دو عیدیں ہوتی تھیں۔ ایک چاند رات کو ایک اگلے دن۔ ڈھیر سارے گلابوں کے ہاروں میں سے ایک سندری کے ہاتھ میں بھی تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھی۔

سفید ساڑھی اور دو چوٹیوں میں وہ سب میں نمایاں تھی۔ پھر گھر کے پورچ میں کئی گاڑیاں آ کر رکیں۔ ایک ہاؤ ہو کار مچی۔ مبارکباد کی خوشیوں بھری آوازیں آنے والوں میں سے سوائے سعدیہ پھوپھو کے سب نے اسے اجنبیت اور حقارت سے دیکھا تھا۔

ابا میاں، دونوں بیٹیوں، حماد اور دامادوں اور نواسوں کے ہمراہ نقاہت سے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ بیٹیاں پذیرائی کو آگے بڑھیں۔ وہ اپنی جگہ پر جھجک کر کھڑی رہ گئی۔

اسی دم ابا میاں کی کمزور آواز ابھری۔

"بھئی، سندری کہاں ہے؟" سب نے پلٹ کر اسے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔

وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھی اور ابا میاں کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ ابا میاں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھا پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ سندری کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"اچھی ہو بیٹی؟"

"جی ابا میاں!" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

"اے لو۔ اس موقع اس ہندنی کا کیا کام۔" سلیمہ پھوپھی نے حقارت سے کہا۔ "ابا میاں۔ ہونہہ۔" صبیحہ بیگم خاموش ہو کر رہ گئیں۔

سب مہمانوں نے وہیں کھانا کھایا۔ ساجدہ نے اسے بہت بلایا مگر وہ نہ گئی۔

رات کو جب سب چلے گئے اور صبیحہ بیگم صبح کے لیے انتظامات میں لگ گئیں اور ساجدہ اپنے کمرے کی صفائی میں۔ تب وہ دبے پاؤں ابا میاں کے کمرے میں چلی آئی۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور آنکھیں بند تھیں۔

"ابا میاں!" اس نے آہستگی سے کہا۔

انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ "آؤ، سندری بیٹیا! آؤ۔" وہ قالین پر دو زانو بیٹھ گئی۔

"ابا میاں!" اس نے پکارا اس کے رخساروں پر اشک رواں تھے۔

"ہاں۔ بیٹی! یہ تم رو کیوں رہی ہو؟" وہ پریشان ہو گئے۔

"ابا میاں! مسلمان کیسے ہوتے ہیں؟ کیسے بنتے ہیں؟"

اور ابا میاں کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔ انہوں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"کیا تم پر کسی نے زور ڈالا ہے۔ کسی نے؟"

"ابا میاں! میرے دل نے زور ڈالا ہے مجھ پر۔" وہ سسک پڑی۔

"ابا میاں۔! وہ برہمن جو مذہبی رسوم ادا کرنے پر مامور ہیں۔ جو صرف تمام ذاتوں میں کھشتری کو کچھ سمجھتے ہیں۔ جو نیچ ذات کے لوگوں سے چھو جائیں تو ناپاک ہو جاتے ہیں۔ وہ جوگی اور یوگی جو جنگلوں میں پھرتے ہیں۔ اپنی آتما کی نجات کے لیے کشٹ کرتے ہیں۔ اور انسانوں کے دکھ درد سے بے نیاز بن میں مارے مارے پھرتے ہیں مگر پھر بھی بے چین۔

ابا میاں! آپ اتنے پوتر ہیں، اتنے پاک۔ مگر جو ہاتھ میرے سر پر رکھتے ہیں۔ اسی سے تسبیح تھام لیتے ہیں۔ آپ کے گھر والے نوکرانی کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ یہ اگر آپ کا دھرم ہے تو میرا بھی بنا دیجئے۔

وہ خدا جس نے آپ کو اوتاروں کا سا مانس بنایا ہے۔ اس سے کہیے مجھے بھی آپ جیسا بنا دے۔" اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

ابا میاں کا وجود لرزنے لگا۔

"یہ۔ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ کیا سمجھ بیٹھی ہے انہیں؟"

"بیٹی! یوں نہ کہو۔ میں ایک گنہگار انسان ہوں۔ بیٹی! وہ رحمٰن ہے۔ اگر تم واقعی مسلمان ہونا چاہتی ہو تو کل ہی میری بچی کل ہی۔ جاؤ۔ اب تم جاؤ۔ میں اس کا شکر ادا کر دوں۔"

انہوں نے جانے کا اشارہ کیا۔ ان کا دل بھر آیا تھا۔ وہ رونا چاہتے تھے۔ انہوں نے پورا ماہ رمضان اس کے لیے دعا مانگتے گزارا تھا۔ خدا نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا تھا۔ وہ ایسے راست باز مسلمان تھے جو چاروں طرف رب کریم کی عظمت کا ذکر ہوتا دیکھنا چاہتے تھے۔

نوجوانی تیر کی طرح ہوتی ہے۔ آگے سب دھندلا نظر آتا ہے۔ چھلانگ مار کر ادھر ادھر منہ مار کر زندگی گزارنے کی آرزو ہوتی ہے۔ پابندیاں جوانی کی ضد ہوتی ہیں۔ نوجوانی آزادی کا نعرہ ہے مگر وہ نوجوانی میں ہی بہت باوضع تھے۔

اور بڑھاپا۔ ایک نوبت کی طرح بج پڑتا ہے۔ گیا۔ سب کچھ گیا۔ بڑھاپے میں تو بڑے بڑے سور ما اللہ رسول کی باتیں کرتے ہیں اور وہ شخص جس کی جوانی کی راتیں بھی تہجد کی چادر میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس کا بڑھاپا ایسا ہی عظیم الشان، باوقار، پُر جلال ہونا چاہیے تھا۔ وہ باہر آئے تو نور کر شور مچاتے ادھر ادھر جا رہے تھے۔ گھر میں خوشیاں اتری ہوئی تھیں۔

اس کے دل پر ایک غبار تھا۔ وہ گم صم تھی۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ تھوڑا سا رونا چاہتی تھی۔

جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر
بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر

صبح تک خوشخبری پھیل چکی تھی۔ سب نے حیرت سے سنا پھر کہا۔ "بہت اچھا ہوا۔"

"تمام مرد نماز پڑھنے جا چکے تھے۔ گھر کی عورتیں مہمانوں کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی تھیں۔ صبیحہ بیگم نے ایک خوبصورت موتیا رنگ کا شلوار قمیض بھی اس کے لیے تیار کیا تھا۔ اس لباس کے لیے ابا میاں نے انہیں رقم دی تھی۔ جب کہ انہوں نے کہا بھی تھا کہ پیسے ہیں ابا جی۔ ابا جی نے کہا تھا۔

"نماز عصر کے بعد قاری حافظ پیش امام الحفیظ مسجد رشید ذاکر حسین تشریف لائیں گے۔ اور ان کے ہاتھ پر سندری قبولِ اسلام کرلے گی۔"

دہاج حسین ذرا چونکے۔ پھر یہ سوچ کر کہ مجبوری بہت کچھ کروا دیتی ہے خاموش ہو رہے۔ شام کو تمام مہمان اور گھر کے افراد ہال میں جمع تھے۔ سامنے ابا میاں قاری صاحب کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔

صبیحہ بیگم نے سندری کو طریقۂ اسلامی کے مطابق غسل کی ہدایت کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سندری خوبصورت شلوار قمیض میں اور کھلے نم بالوں پر پھول دار چادر پہنے جس میں سے صرف اس کا چہرہ جھانک رہا تھا آ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بری طرح گھبرا رہی تھی۔

ساجدہ نے دیوان کے ایک سرے پر جا کر ٹکا دیا۔ پیازی کرتا شلوار پہنے جسے سندری نے سیا تھا۔ شاید ساجدہ سب سے زیادہ خوش تھی۔ تھوڑی دیر بعد حافظ صاحب کی آواز گونجی۔

"ہاں بیٹی! پڑھو۔" سندری نے کپکپاتی آواز میں ان کے ساتھ بسم اللہ پڑھی۔

پھر کلمہ پڑھایا۔ "پڑھو بیٹی کلمہ شہادت۔"

ابا میاں نے کلمہ شہادت کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ تب اس نے پوچھا تھا۔

"شہادت کے معنی گواہی کے ہیں۔ گواہی کیونکر دیتے ہیں؟"

"بیٹا! گواہی ہمارا دل دیتا ہے۔ ہمارا دل گواہ ہے۔"

"ہاں بیٹی پڑھو۔" سندری نے کلمہ شہادت پڑھا اور پھر ترجمہ بھی۔

"کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔"

(ہاں میں نے گواہی دی۔ میرے دل نے گواہی دی۔ کوئی پتھر معبود نہیں۔ صرف وہ نور ہے جو دھیرے دھیرے مجھے حصار میں لے رہا ہے۔")

حافظ صاحب نے قرآن مجید کی تھوڑی سی تلاوت کی تھی۔ جو صحیح راستے پر چلنے والوں کے لیے خوشخبری سے متعلق تھی۔ پھر انہوں نے دعائیہ انداز میں ہاتھ بلند کیے۔

"یا رحمٰن! اے رب العلمین۔ تیرے بہت سے گمراہ گو جرات مندوں میں اس بچی کا نام بھی آ گیا ہے۔ جو تیری رضا کے بغیر ممکن نہ تھا۔ میری دعا ہے اس بچی کو راہِ ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ اے خدا! اسے ارکانِ دین سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرما۔ اے خدا! اس بچی کے راستے کی مشکلات کو دور فرما۔ اس بچی کو نیکی کرنے کا حوصلہ بخش دے کہ اس کے آگے آنے والے اس پر فخر کریں۔ اے خدا! اسے اپنی پناہ میں رکھو۔"

سندری کی حالت غیر ہونے لگی۔ کل تک اس کا کوئی نہیں تھا۔ آج اس کے سب تھے۔ دعائیں مانگ رہے تھے اس کے لیے۔

ابا میاں کی آواز ابھری۔ "بیٹی کا نام سندری ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد آج سے ارجمند بیگم ہے یہ۔"

پھر سب نے لے کر اور ابا میاں کو ڈھیروں مبارکباد دی۔ اس کا چہرہ پھولوں کے ہار سے چھپ گیا۔

... حل کچھ تو نکل آئے گا حالات کی تنقید کا ...

اے کبریت الالام میں کچھ سوچ رہا ہوں

پھر ابا جی نے ایک قاریہ حافظہ کو اس کی دینی تعلیم پر مامور کیا۔ وہ غریب عورت ابا میاں کی نمک خوار تھی جی جان سے سندری (ارجمند بیگم) پر محنت کر رہی تھی۔ ابا میاں نے ممانعت کر دی تھی آئندہ کوئی اسے سندری نہ کہے۔ بلکہ ارجمند کہے۔

وہ تو بہت ہی ذہین تھی۔ دلجمعی سے قرآن سیکھ رہی تھی۔ وہ جلد از جلد قرآن سیکھ کر ابا میاں کی طرح رواں پڑھنے کی خواہش مند تھی۔

ابا میاں نے اس کے قیام کے متعلق درخواست دے دی تھی۔ اب وہ ایک ماہ مزید یہاں رک سکتی تھی۔ ساتھ ابا میاں نے اس کی شادی کی کوشش بھی شروع کر دی۔ اخبار میں بھی اشتہار دے ڈالا جو کچھ یوں تھا۔

"ایک خوبصورت انتہائی شریف مناسب تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے جس نے حال ہی میں اسلام قبول کیا ہے۔ اس کا پچھلا مذہب ہندو تھا۔

ایک شریف النفس پڑھے لکھے نوجوان کا رشتہ درکار ہے جو لڑکی کو خوش رکھ سکے۔ اس کا خود بھی اسلام کے ارکین کا پابند ہونا ضروری ہے۔ شادی بیس دن کے اندر اندر کرنا ہے۔ جہیز کے لالچی محض حسن کے پرستار زحمت نہ کریں۔"

صبیحہ بیگم سے ابا میاں نے کہا تھا وہ جہیز کا چارا ڈالنا نہیں چاہتے۔ اس طرح صحیح غلط کا پتہ نہیں لگے گا۔ ورنہ بچی کو کچھ نہ کچھ تو دیں گے ہی۔

اشتہار چھپنے کی دیر تھی کہ بہت سے خطوط آ گئے۔ ابا میاں نے بنفسِ نفیس ملنا پسند کیا مگر وہ بہت مایوس ہوئے تھے۔ کوئی بھی ان کے معیار کے مطابق نہ تھا۔ وہ دو انٹرویو کے بعد تھکے ہارے لیٹ گئے تھے۔

سلیمہ پھوپھو آئی ہوئی تھیں۔ وہ سب لان میں تھے سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ وہ حماد کا کرتہ کاڑھ کر اسے دکھانے اس کے کمرے میں آئی تو وہ اوندھا لیٹا ہوا تھا۔

"حماد!"

"ہوں، کون ہے بھئی؟" وہ جھنجلایا۔

"میں ہوں حماد! تمہاری ارجمند باجی۔"

"کیا ہوا؟"

"دیکھو تمہارا کرتا تیار ہو گیا ہے۔ ذرا دیکھ لو کیسا لگ رہا ہے۔"

"دیکھ لوں گا۔" وہ اسی طرح لیٹے ہوئے بولا۔

"ضد نہ کرو۔ اتنے شوق و لگن سے بنایا ہے۔ اٹھو نا میرے بھائی۔" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"ٹھیک ہے پھر میں جا رہی ہوں۔ تم لوگ شاید مجھ سے آج بھی نفرت کرتے ہو۔ ورنہ تم میری بات اس طرح نہ ٹالتے کتنے شوق سے لے کر آئی تھی۔"

وہ پلٹی۔ تب حماد نے کھلکھلا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ناراض نہ ہوں۔ ویسے ہی جلنے والی ہیں۔"

وہ شرارت سے ہنسا۔ ارجمند اسے مبہوت سی دیکھتی رہ گئی۔ اسے اس کی ہنسی ایک معصوم بچے کی کلکاری کی طرح لگی۔ کتنا خوبصورت انداز تھا اس کے ہنسنے کا۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" اس نے ارجمند کا ہاتھ جھٹکا۔

"کچھ نہیں بس۔ یہی کہ خدا تمہیں ہر بری نظر سے بچائے۔"

"ارے اتنا حسین کہاں ہوں۔ ساجدہ تو کہتی ہے کہ میری شکل صبح صبح دیکھ لے تو سارا دن روتے ہوئے گزرتا ہے۔"

"ایسے ہی تمہیں تنگ کرتی ہے۔" اس نے پیار سے کہا۔

"شاید ایسے ہی جیسے میں آپ کو کرتا ہوں۔" وہ شرارت سے ہنسا۔

"مگر وہ تمہیں اپنی باجی نہیں سمجھتی۔" اس نے مسکرا کر چھیڑا۔

"مجھے پتا ہے باجا سمجھتی ہے وہ۔ کہتی ہے ہر وقت بجتے رہتے ہو۔" وہ مسکرایا۔

ارجمند کھلکھلا پڑی۔ وہ سیدھا لیٹ چکا تھا۔ اس نے کرتا اس پر پھیلا دیا۔ وہ مزے سے لیٹا رہا۔ وہ جھک کر ہاتھ سے ٹھیک کر کے دیکھنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کیے مسکراتا رہا۔ ارجمند نے شفقت سے مسکرا کر دیکھا۔

"بس زیادہ اتراؤ نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ نہا کر پہن لو سب کو دکھاؤ کیسے لگو گے۔" وہ سیدھی کھڑی ہو گئی۔

مگر اتنی دیر میں باغ میں بگولے اٹھنے لگے تھے۔

"ارے سلیمہ سچ کہو۔" صبیحہ بیگم سناٹے میں رہ گئیں۔

"اے بھابی بیگم! جس کی کہو قسم کھا لوں۔"

دہاج حسین کی پیشانی کی سلوٹیں گہری ہو گئیں۔ انہوں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ساجدہ کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ منہاج حسین آفس سے نہیں لوٹے تھے۔ ابا میاں کمرے میں تھے۔

"سلیمہ! ابا میاں کے سامنے ذکر نہ کرنا ان کا تو دل بیٹھ جائے گا۔ میں خود دیکھوں گی۔" وہ دیور سے نظریں چراتی ہوئی بولیں۔

"ذرا اچھی طرح دیکھ لیجیے گا بھابی۔" دہاج حسین اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں تو اسی دن کے لیے ڈرتی تھی بھابی بیگم!" سلیمہ گویا ہوئیں۔

"ایک مہربانی اور کرنا سلیمہ! کسی سے تذکرہ نہ کرنا بڑی بدنامی ہوگی۔" وہ روہانسی آواز میں بولیں۔

"اے بھابی! مجھے کیا پڑی۔ آخر یہ میرا میکہ ہے۔ آبرو ہے میری۔ اپنے باپ بھائیوں کے سر میں کیوں خاک ڈلوانے لگی۔"

"تم ٹھہرو۔ میں دونوں کو بلا کر لاتی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ہے جو کسی کے بس کی بات نہیں۔ میں ان کا کیا لگتا ہوں مگر یہ میرے ذرا ذرا سے آرام کا خیال کرتی ہیں۔"

اس نے ارجمند کو بازوؤں کے حصار میں لے لیا جو پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

"انہیں میں اس قدر محترم سمجھتا ہوں کہ آنکھوں سے چوم کر بلند جگہ پر سجانے کو جی چاہتا ہے کسی مقدس کتاب کی طرح۔" اس کی آواز بھرا گئی۔ اس بات پر ارجمند کے آنسو بہہ نکلے۔

"غالباً آپ ابھی میرے کمرے میں آئی تھیں جب باجی کُرتا لے کر آئی تھیں۔ اور دیکھنا چاہتی تھیں کہ ٹھیک ہے یا نہیں۔"

تب صبیحہ بیگم نے چونک کر حماد کی جانب دیکھا۔ وہ کرتا پہنے کھڑا تھا۔ جو تھوڑی دیر قبل وہ مکمل کر رہی تھی۔

وہ لاابالی سا لڑکا اس کے دامن کا داغ دھو رہا تھا۔

وہ خاموش کھڑی رہی۔ ایک لفظ نہ بولی۔

"اے ہاں، یہ سلیمہ تو شروع دن سے ارجمند کے پیچھے پڑی ہیں۔ گویا باپ اسے کسے بر سند نہ ہوں، میری بھی تو مت ماری گئی۔ اتنے دن سے یہ یہاں ہے کوئی غلط بات نہیں دیکھی۔ تو بھلا بچوں کے سامنے ذرا سی کوڑی کا کر کے رکھ چھوڑا۔"

ان کا دل چاہا اپنی حماقت پر ماتھا پیٹ ڈالیں۔ آخر اور طریقے سے بھی بات ہو سکتی تھی۔ مجھے تو پہلے ہی اپنے بچوں پر اعتماد ہے۔ ان کے دل میں نند کی طرف سے کدورت سی بیٹھ گئی تھی۔ جو خود بھی کھسیانی ہوئی تھیں۔

"اب بھلا واہج حسین کیا سوچ رہے ہوں گے سلیمہ! کیا ہی اچھا ہوتا یہ بات اگر ان کے سامنے ہوتی۔" وہ نند سے سرد مہری سے گویا ہوئیں۔

دونوں چونک گئے کہ یہ بات واہج حسین کو بھی معلوم ہے حماد کو باپ کا تصور کر کے بہت شرم آئی۔ سلیمہ پھوپھو بھاوج کے موڈ کا اندازہ کر کے زیادہ دیر نہیں رکیں۔ بس آپا میاں سے مل کر فوراً چل دیں۔

حماد نے ارجمند کو مسکرا کر تسلی دی تھی۔

"کوئی بات نہیں باجی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ آپ اثر نہ لیجئے گا۔ دیکھئے تائی اماں کتنی شرمندہ ہیں۔ میں اپنے بابا کے سامنے بھی یہ بات کر دوں گا۔ ہم بالکل دوستوں کی طرح ہیں۔ آپ پریشان مت ہوئیے گا۔ بس میری پھوپھو ہیں۔ میں کچھ کہہ تو نہیں سکتا۔ اگر آپ مجھے واقعی چھوٹا بھائی سمجھتی ہیں تو میری بات مانیں۔ پہلے کی طرح مسکرائیں۔"

وہ اسے دلاسے دے رہا تھا۔ مگر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ "واہج حسین — واہج حسین۔ اُف کس قدر ان کی نظروں سے گر گئی ہوں گی میں۔"

واہج حسین نے بیٹے کو خود ہی بلوا لیا تھا۔

وہ ان کے بولنے سے پیشتر ہی جرأت مندی سے بول اٹھا۔

"بابا! الزام لگانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ ملزم کی عمر کتنی ہے اور جو الزام اس پر لگایا جا رہا ہے۔ وہ اس الزام کو سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ یقین کریں بابا! میں تو سمجھ ہی نہیں پایا کہ مجھ سے کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ میری بڑی بہن کی طرح ہیں۔ پھوپھو نے ہم سب کو ایک دوسرے کی نگاہوں میں گرا دیا ہے۔" اس نے ناراضگی سے کہا۔

واہج حسین نے حیران ہو کر اپنے اسمارٹ اور بولڈ سے بیٹے کو دیکھا۔ انہیں اس کی یہ جرأت مندی پسند آئی تھی۔ وہ تو سمجھ رہے تھے وہ جھینپا، شرمایا اور گھبرایا کھڑا رہے گا۔

اور صبیحہ بیگم یہ سن کر کہ حماد کو واہج نے بلایا ہے۔ ہانپتی کانپتی آ پہنچیں۔

"تائے تو بہ — سلیمہ نے تو تالاب میں کنکر پھینک مارا۔ ہمارے بچے کیا جانیں ان باتوں کو۔ سلیمہ تو — معاف کرنا واہج! بہن ہے تمہاری۔ مگر میں اس گھر کی بڑی ہوں۔ آنکھ، کان سب تیز تو نہیں۔ سلیمہ کا تو وہ حساب ہے کہ — میں کون کہ خواہ مخواہ۔" انہوں نے محاورہ پیدا کیا۔ "اب بھلا اپنے گھر کی ہیں! اس گھر کو دیکھنے کے لیے ابھی میری آنکھوں میں روشنی ہے — محبت کی لڑکی ہے سب سے خوش مزاجی سے ملتی ہے۔"

واہج حسین کو بھی خواہ مخواہ کی بات اٹھنے پر افسوس ہوا وہ خود بیٹے کے سامنے شرمندہ تھے۔ کتنا معصوم اور کھلنڈرا سا بیٹا۔ انہوں نے اپنی عمر بھر کی کمائی کو نظر اٹھا کر دیکھا۔

وہ قد میں ان کے برابر ہو چکا تھا۔ جسمانی طور پر کچھ ان سے دُبلا تھا — ذہانت کی روشنی سے منور آنکھوں میں جھنجھلاہٹ اور بیزاری بھری تھی۔ وہ بیٹے کے روپ میں گویا خود کو بیس سال پیچھے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ خود ایک شرمیلے سے نوجوان تھے۔ وہ تھا بھی باپ کا عکس۔

انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"جاؤ بیٹا کوئی بات نہیں۔ آئی ایم ساری مائی سن۔"

وہ دھیمے سے مسکرائے اور صبیحہ بیگم خدا کا شکر ادا کرتی باہر نکل آئیں۔ بات سچ ہوتی تو کس قدر بُری تھی۔ جھوٹ نکلی تو کچھ بھی نہیں۔ مگر وہ اپنے بستر پر بہت بے قرار تھی۔

واہج حسین کا کمرہ بند ہو چکا تھا۔ وہ حماد کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ وہ باتھ روم میں تھا۔

"حماد!"

"جی تائی اماں!"

"نہا لو تو لان میں آ جانا۔ ضروری بات کرنا ہے۔" پھر وہ ساجدہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔

ان معصوموں کو تو خبر بھی نہ تھی کہ باہر کیا طوفان آ چکا ہے۔ بار بار کے بلانے پر بھی حماد نہ آیا تو سلیمہ پھوپھو خود بلانے آئی تھیں۔ مگر اسے حماد پر جھکا دیکھ کر اور ہنسی کی آواز سن کر الٹے قدموں واپس لوٹ گئی تھیں۔

"ارجمند!" انہوں نے دروازے میں کھڑے ہو کر پکارا۔

"جی۔"

"ذرا لان میں آؤ۔" وہ ان کے سرد رویے پر حیران سی ان کے پیچھے چلی آئی۔

سلیمہ پھوپھو نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ ان کا یہ انداز اس کے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ سہم گئی۔ حماد بھی چند لمحوں میں آ گیا۔ سفید نئے کرتے پاجامے میں وہ انیس بیس سال کا لڑکا خوبصورت بالوں کو پیشانی سے جھٹکتے ہوئے آستینیں پلٹ رہا تھا۔ اور نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہا تھا۔ ساجدہ نے اسے دیکھ کر سر جھکا لیا۔

"اے بی بی۔ کیا تعزیت کر کے آ رہی ہو؟" اس نے حسبِ عادت چھیڑا۔ "منہ کیوں لٹکا رکھا ہے؟"

"خاموش رہو حماد!" صبیحہ بیگم نے اسے ڈانٹا۔

وہ سخت حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔ یہ صورتِ حال تو اس گھر میں وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

"حماد! کیا تم بہت بڑے ہو چکے ہو؟" انہوں نے سرد مہر انداز میں عجیب سا سوال کیا۔

"کہاں تائی اماں! آپ خود ہی تو کہتی ہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن کا ہوں۔ شاید بیس سال سے آٹھ دن کا ہوں۔" وہ خفیف سا مسکرا دیا۔

"تم جانتی ہو۔ یہ تم سے تقریباً چھ یا سات برس چھوٹا ہو گا۔" وہ اب ارجمند سے مخاطب ہوئیں۔

"مجھے پتہ ہے۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"اور شاید یہ بھی پتہ ہو کہ جب تم یہاں آئیں تو تمہارے پیٹ میں روٹی تک نہیں تھی۔" سلیمہ پھوپھو نے حقارت سے کہا۔

"جی، مجھے یہ بھی یاد ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"تو بی بی! یہ کہاں کا انصاف اور احسان مندی ہے کہ جس تھالی میں کھاؤ اسی میں چھید کرو۔ خوب صلہ دیا بی بی! اس گھر نے تمہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ تمہاری جھوٹی سچی باتوں پر یقین کیا۔ بھابی بیگم کی جگہ کوئی ہوتا تو تمہیں دو وقت کی ملازمہ شاید ضرور رکھ لیتا۔ بیٹی کے بستر پر نہ سلاتا۔"

"کیا ہو گیا ہے پھوپھو!" حماد ان احسانات کے شمار پر جھلا اٹھا۔

"یہ تو میاں! تم زیادہ جانتے ہو۔ ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن سے خود کو سنبھالا نہیں جاتا۔ بی بی! غیرت نہ آئی۔ اس آم کے کچے بور کے سے بچے کو تباہ کرتے ہوئے۔ بی بی! ہم عزت دار — خاندانی لوگ ہیں۔ یہ تمہارے بھائی بیٹے کی جگہ ہے۔"

"پھوپھو!" حماد کی آواز بہت بلند تھی۔ جذبات کی تپش نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آگے کیا بولے۔ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔

"تائی اماں! کیا آپ مجھ سے اس قدر گری ہوئی حرکت کی توقع کر سکتی ہیں؟" وہ تائی کی سمت پلٹا۔

"اے بیٹا! تم تو بچے ہو۔ قصور تو سارا اس گنوں پوری کا ہے۔ بڑی احسان فراموش۔"

"بس کریں پھوپھو!"

"اے کیا بس کروں۔ کانوں سنی نہیں آنکھوں دیکھی ہے۔ ابھی جو یہ تمہاری سیوا کر رہی تھی۔ لوری سنا رہی تھی نا تمہیں۔" وہ طنزیہ بولیں۔

اور ارجمند — کی سانسیں چلنا بھول گئی تھیں۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ اس نے متوحش نظروں سے حماد کو دیکھا۔ کک — کیا — یہ اتنا بڑا ہے کہ مجھ پر انگلی اٹھائی جا سکے؟

تب حماد نے اس کے شانوں پر پڑے دوپٹے کو اٹھایا۔ اور ارجمند کے سر پر ڈال دیا۔

"خدا کی قسم تائی اماں! یہ اس قدر رکیک الزام ہے۔ کہ میری انا صفائی پیش کرنا پسند نہیں کرتی مگر اب یہ میری ہم مذہب بہن کی عزت کا معاملہ ہے۔ ہم تو آپس میں ایسی باتوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے ہمیں ہماری نظروں میں کس قدر گرا دیا ہے۔ ان کو تو ایسی محبت کرنی آتی

وہاج حسین کیا سوچتے ہوں گے۔ اس گھر کا ایک فرد بھی مجھے غلط سمجھے۔ یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔"

عمر بھر کو داغ دے جاتی ہے ادنیٰ لغزش بھی
جرم ثابت ہو نہ ہو الزام پھر الزام ہے

اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہاج حسین کے کمرے میں جانے کی مگر کروٹیں بدل بدل کر بھی تھک گئی تھی۔ نہیں مجھے انہیں بتا دینا چاہیے کہ میں خود کو ان کی نمک خوار سمجھتی ہوں۔ اور کچھ نہیں۔ اس نے ساجدہ کی سمت دیکھا۔ وہ جوانی کی آسودہ اور بے خبر نیند لے رہی تھی۔

اس نے ارجمند کی ٹھوڑی چھو کر کتنے پیار سے کہا۔

"باجی! کتنی زیادتی ہوئی ہے ہم سے۔"

شاید یہ لوگ اس قدر مطمئن ہو گئے تھے کہ وہاج حسین سے بات کرنا بھی یاد نہ رہی۔ اس نے کسی کو وہاج حسین سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

شاید۔ وہ سو چکے ہوں۔ مگر میں کیا کروں۔ جو دل پر بوجھ سے آنکھوں میں نیند آنے نہیں دے رہا۔ وہ دوپٹہ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور دبے پاؤں باہر چلی آئی۔

ان کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس نے شکر ادا کیا۔ ایک بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔

اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا جو فوراً کھل گیا۔ روشن کمرے میں وہاج حسین نہیں تھے۔ وہ حیران سی تھی کہ وہ سامنے باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آ گئے۔ انہیں اچانک اس طرح روبرو دیکھ کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ ان کے سامنے تو اس کی جان ویسے ہی پانی بن جاتی تھی۔

وہ خود اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا۔ جب انہوں نے اسے بغور دیکھا۔ عنابی اور نیلے پھولوں کے سوٹ میں پرنٹڈ دوپٹے کو سر پر ڈالے وہ بے حد گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"جی۔ فرمائیے۔ کیا بات ہے؟" انہوں نے اپنے مخصوص سرد سے انداز میں پوچھا۔ عجیب سی الجھن ہوتی تھی اسے دیکھ کر۔

وہ جھجکتی ہوئی آگے بڑھ آئی۔ "کیا آپ میری بات سنیں گے؟"

"کہو۔" انہوں نے بیزاری سے کہا۔

"جو کچھ شام کو ہوا۔ مجھے بہت شرمندگی ہے۔ مگر میں ایسی نہیں ہوں۔ وہ بہت پیارا بچہ ہے۔ چھوٹے بھائی کی طرح ہے میرے لیے۔ کیا آپ مجھے ایسا تو نہیں سمجھتے؟"

اس نے لرزتی ہوئی پلکیں اٹھائیں۔

"بھئی۔ مجھے کیا آپ کیسی بھی ہوں محترمہ! جائیے جا کر آرام کیجئے۔ مجھے اپنے بیٹے پر ناز ہے۔ اگر آپ چاہتیں بھی تو وہ اس قسم کا ہے نہیں۔" ان کے منہ سے بہت غلط بات نکل گئی۔

اس کا کلیجہ جیسے کسی نے نوچ لیا۔ وہ یکلخت آگے بڑھ کر ان کے قدموں میں جھک گئی۔

"اگر آپ کا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ تو میں۔ میں بھی ایسی نہیں ہوں۔ اس گھر کے ہر فرد کا احسان ہے مجھ پر۔ مجھے چھت دی۔ تحفظ دیا۔ سارے سنسار کی باتیں سنیں۔ میں احسان فراموش نہیں۔ اگر آپ کے دل میں کوئی برا خیال ہے تو اسے نکال دیں۔ اس گھر نے مجھے آبرو دی۔ پیٹ کی آگ بجھائی۔ آپ نے شام کو جو سنا غلط ہے۔ وہ میرا بھائی ہے۔ چھوٹا سا بچہ۔"

وہ تڑپ تڑپ کر رو دی۔ "آپ یقین کریں۔ آپ یقین کریں اس گھر نے مجھے آبرو دی۔ میں اب اس گھر کی آبرو کی خاطر جان دے سکتی ہوں۔ میں ایسی نہیں ہوں۔ ایسی نہیں ہوں۔ ایسی۔"

وہ رو رو کر نیم جان ہو گئی۔

"مجھے چین نہیں آ رہا تھا یہ سوچ سوچ کر کہ آپ مجھے کس قدر پست سمجھ رہے ہوں گے۔" اس کے لہجے کی سچائی نے ان کا وجود پگھلا سا دیا۔ اس کے آنسوؤں سے ان کے پاؤں بھیگ گئے تھے۔

"ارے بی بی۔ ! مجھے بتا دیا تھا بھابی بیگم نے۔ شام ہی کو۔ بی بی! اگر تم غلط ہوتیں تو ہم تمہیں ایک منٹ بھی اپنے درمیان رکھنا گوارہ نہ کرتے۔ خواہ ابا میاں کچھ بھی کہتے۔"

وہ اسی طرح ہچکی رہی تب انہوں نے جھجکتے ہوئے سر اٹھایا اور ساڑتی پڑتی نگاہ ڈال کر کہا۔

"جاؤ بی بی آرام کرو۔ تم کم عمر بھی ہو اور حساس بھی۔"

اس کا سہرا کردار اور وجود ان کے منہ سے یہ الفاظ بھی نکلوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ سرخ سرخ آنکھیں، سرخ ناک، پھڑکتے ہوئے خوبصورت لب وہ عجیب ڈھیلی ڈھیلی سی ہو رہی تھی۔

"آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔" وہ جانے کو پلٹی مگر اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ابا میاں تسبیح ہاتھ میں لیے بہت خاموش نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ وہاج حسین الٹے قدموں پلٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ابا میاں کی مدھم سی آواز ابھری۔ "جاؤ۔ ارجمند! تم جاؤ۔"

"آپ۔! ابا میاں! سوئے نہیں؟" وہاج حسین نے پوچھا۔

انہوں نے نارمل ہو کر کہا۔

"کمرے میں بہت گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جائے نماز باہر گھاس پر بچھا رکھی تھی۔ تمہارے کمرے کی بتی جلتی دیکھ کر آ گیا کہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں؟" ان کا لہجہ ہر جذبے سے عاری تھا پھر گویا ہوئے۔

"وہاج! یہ لڑکی بہت مناسب ہے۔ تم مجھ سے بات کر لیتے تو بہت بہتر تھا۔"

"ابا میاں!" وہ بری طرح بوکھلا کر رہ گئے۔ "بات یہ ہے۔"

"وہاج بیٹا! تم کوئی کالجیٹ نوجوان نہیں ہو۔ تمہیں یہ سب زیب نہیں دیتا۔ آخر تم اسے وقتی خوش فہمی میں کیوں مبتلا رکھنا چاہتے ہو۔ بیٹا! اب تم میں بہت جرأت آ جانی چاہیے۔ تم کوئی کھلنڈرے لڑکے نہیں ہو۔ ہمارے لیے یہ خوشی کی بات ہے۔"

"ابا میاں!" اس بار وہاج حسین کی آواز میں جھلاہٹ شامل تھی۔

"بات یہ نہیں ہے۔ آپ میری بات تو سنیں۔ حد کرتے ہیں آپ بھی۔ میری اس کی عمر کا اندازہ تو کریں۔ کیا میں اس کے ساتھ اس قسم کی۔"

"دیکھو وہاج! اگر تم حوصلہ نہ دیتے تو اس کی مجال نہیں تھی۔ وہ تمہارے کمرے میں آتی۔"

"وہ خود آئی تھی ابا میاں!"

"دیکھو وہاج! اپنی عزت کی خاطر سارے الزام اس بچی پر نہ دھرو۔"

"خدارا آپ میری بات تو سنیں۔"

"میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے۔ وہ کسی آواز کا محتاج نہیں۔ شاید تمہیں اپنے بیٹے کا احساس ہے اس لیے جھجک رہے ہو۔ مگر ہماری نظر سے دیکھو۔ آج بھی بچے لگتے ہو۔"

"ابا میاں۔ آخر آپ میری بات کیوں نہیں سنتے۔ ٹھیک ہے ابھی اسے بلا لاتا ہوں۔ عجیب احمق لڑکی ہے۔" وہ زچ ہو کر بولے اور باہر کی سمت بڑھے۔ بری طرح تپ رہے تھے۔ "وہ خود آپ کو ہر بات بتائے گی۔"

"ٹھہرو۔ تم مت جاؤ۔ میں بلاتا ہوں۔" وہ پلٹ گئے۔

وہاج حسین کا اب سارا زلزلہ ارجمند پر گر رہا تھا۔ وہ سوچ سوچ کر دانت پیس رہے تھے۔ "بھلا یہ تمہی باپ کے سامنے ذلیل ہونے کی۔ کیا کہہ گئے ابا میاں۔ لاحول ولا قوۃ۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ابا میاں کے ہمراہ مطمئن سی داخل ہوئی۔

"بھئی لڑکی! تم میری جان کس عذاب میں ڈال گئیں۔ بتاؤ ابا میاں کو تم کیوں آئی تھیں۔ آدھی رات گئے یہاں؟"

وہ ہاتھ مسل کر خاموش کھڑی رہی۔

"کیا مصیبت ہے بھئی! بات صاف کیوں نہیں کرتیں؟" وہ برہمی سے بولے۔

مگر وہ خاموش کھڑی ہونٹ چباتی رہی۔

"ابھی تو بہت ڈائیلاگ بولے جا رہے تھے۔ اب کیا زبان سِل گئی ہے؟" وہ اس کی خاموشی پر مشتعل ہو گئے۔

"ہوں، یہ ڈائیلاگ بول رہی تھی۔ اور تم سن رہے تھے؟" ابا میاں نے اپنے پختہ عمر کے بیٹے کو گھورا۔ وہ بری طرح گڑبڑا گئے۔

سیاہ کناروں والے آسمانی نائٹ ڈریس میں وہ غصے سے سرخ ہو رہے تھے۔

"ابا میاں! خدارا اس لڑکی کا کہیں انتظام کر دیں۔ ورنہ اس گھر میں روز کچھ نہ کچھ ہونے لگے گا۔"

"ہاں وہاج! اب تم شرمندگی میں اسے ذلیل کرنے پر اتر آئے ہو۔"

"جاؤ۔" انہوں نے ارجمند کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکل گئی۔

وہاج حسین پشت کیے کھڑے تھے اور بری طرح کھول رہے تھے۔ بلاشبہ وہ بہت شرمندگی بھی محسوس کر رہے تھے۔

"پرسوں جمعہ ہے۔ وہاج! بہتر ہے تمہارا عقد کر دیا جائے۔"

اور ان کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔

"ابا میاں!" اب وہ سکون سے بولے۔ "اتنی اچھی اچھی لڑکیوں کے رشتوں کی آفرز ہوئیں کیا میں نے اقرار کیا۔ یہ لڑکی جس کے آگے پیچھے کا کوئی پتہ نہیں۔ آپ اسے محض غلط فہمی کی بنا پر میرے گلے کا ہار بنائیں گے جو عمر میں بھی بہت چھوٹی ہے۔ پلیز! آئندہ یہ بات کبھی تصور میں بھی! لائیے گا۔ آپ

کو شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ بات دراصل یہ ہے۔ ابا میاں کہ شام کو ــــ "

"بس کرو وہاج !" ابا میاں کا لہجہ پُر جلال ہو گیا۔ "تم لوگ تجربہ کر کے نتیجے پر پہنچتے ہو۔ ہماری عمر ایک بڑی تجربہ کاری کی داستان ہے۔ انسانوں کو پرکھنے میں شاید ہم تم سے زیادہ زیرک اور باریک بین ہیں وہاج ! تمہیں قطعی زیب نہیں دیتا کہ تم کسی شریف عورت کو خوش فہمی میں مبتلا کرو۔ یہ وقت گزاری کی باتیں کھلنڈرے شوقین مزاج نوجوانوں کا انداز ہوتا ہے۔ میری بھی یہی خوشی ہے کہ تمہارا گھر بس جائے۔ اور شاید تم بھی اب اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہو۔ تمہیں ڈرنے اور جھجکنے کی کوئی ضرورت نہیں جب ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

وہ اپنی چھڑی اٹھا کر باہر نکل گئے۔ اور وہاج حسین کا جی چاہا اپنا ریوالور نکال کر اسے گولی مار دیں۔ یا خود خودکشی کر لیں۔

صرف ایک ذرا سی زبان ہلانے سے وہ سُرخرو ہو سکتے تھے مگر وہ خاموش کھڑی رہی۔ احمق، بے وقوف۔ جاہل۔ لگتا ہے آج صبح سب گھر والوں نے قسم کھائی تھی کہ آج کا دن اور رات الزام تراشی کے نام کریں گے۔ حد ہو گئی۔

صبح بھابی بیگم سے بات کروں گا کہ اس لڑکی کو نکالیں فی الفور کوئی انتظام کریں۔

یہ کوئی دارالامان یا یتیم خانہ نہیں ہے۔

حد ہو گئی۔ ایک ابا میاں ہیں کہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں۔

"سچ ابا میاں ؟" صبیحہ بیگم کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔

"مگر ابا میاں۔ ! بہت مشکل ہے۔ وہاج کبھی راضی نہ ہوں گے۔"

"تم کہو دلہن : کیا کمی ہے اس بچی میں ؟"

"مگر ابا میاں : ارجمند سے بھی بات کی ؟"

"کرلیں گے اس سے بھی بات۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

"دلہن ! لوگ باہر سے انگریز عورتیں بیاہ کر لاتے ہیں۔ وہ عورتیں جو صرف شادی کی خاطر نام کی مسلمان ہوتی ہیں جو ساری زندگی نماز تک نہیں پڑھتیں ان کی کوکھ سے جنم لینے والے بچے بھی انگریز نما ہوتے ہیں۔ گویا ایک مسلمان مرد سیم لا کر اپنی نسل تک کو غلط راہ دیتا ہے۔ جب اس پر کوئی اعتراض نہیں تو اس پر کیوں ؟ الحمدللہ بچی مسلمان ہو چکی ہے۔ اپنی خوشی سے نماز ادا کرتی ہے۔ انتہائی تابعدار اور سادہ اور دلہن یہ نیک کام ہے۔"

"جی ابا جان !"

"دلہن تم حماد کو بھی ذرا سمجھانا۔ اس کی رائے کو ہمارے حق میں کرنے کی کوشش کرنا۔"

"جی ابا میاں !"

"اس بچی کا رشتہ مانگنے جو بھی آیا مناسب نہیں رہے گا۔ ہم بے سوچے سمجھے اسے بوجھ کی طرح اتار پھینکنا نہیں چاہتے۔ کوئی اکیلا ہے۔ کوئی بیوی سے چھپ کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر ابا میاں : وہاج سے زبردستی مت کیجئے گا۔ وہ کوئی نوجوان لڑکے نہیں۔ جوان بیٹے کے باپ ہیں۔ ابا میاں ! ارجمند کی خوشی بھی ملحوظ رکھنا ہوگی۔ اسے یہ احساس نہ ہو کہ ہم اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"تم بے فکر رہو دلہن !"

شام کو وہ حماد کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ لیٹا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔

"کیا پڑھ رہا ہے ہمارا بیٹا ؟"

"ایسے ہی تائی اماں !" وہ مسکرایا۔

وہ کھڑی اسے بغور دیکھتی رہیں۔

"خیریت تائی اماں ؟"

"خیریت ہے بیٹا !" وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ چند لمحوں تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔

"حمی بیٹے !"

"جی۔"

"تم جانتے ہو بیٹا ! جب تمہاری ماں کا انتقال ہوا تو وہاج چوبیس، پچیس برس کے تھے۔"

وہ خاموش رہا۔

"بیٹا ! انہوں نے تمہارے خیال سے شادی نہیں کی کہ سوتیلی ماں جانے کیسی ہو۔ بہت پیار ہے انہیں تم سے۔" وہ رک گئیں۔

"یہ بھی کوئی بتانے کی کوئی بات ہے۔" اس نے سوچا۔ "درحقیقت بابا کو مجھ سے بے حد پیار ہے۔"

"بیٹا ! اس وقت وہ چوالیس برس کے ہیں۔ آج کل تو ویسے ہی تیس پینتیس برس کی عمر میں مردوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے بہت وقت تنہا گزار لیا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ ان کو بھی کوئی ساتھی لا دیں۔"

حماد بُری طرح چونک گیا۔ ایک تو اس گھر میں تیزی سے واقعات ظہور پذیر ہونے لگے تھے۔ ڈرامائی سے واقعات۔ کل کچھ۔ آج کچھ۔

"تو بیٹا ! بُری بات تو نہیں نا یہ ؟ آخر وہ انسان ہیں۔ ان کے دل میں بھی ارمان ہوں گے۔ مگر شاید وہ تمہارے خیال سے کبھی ایسا نہ کریں۔ بس ابا میاں کی اور ہماری مرضی ہے۔ بیٹا ہم اتنے اچھے انسان کو کوئی خوشی دینا چاہتے ہیں۔ کیا غلط بات ہے ؟"

حماد کافی دیر کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

"بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں اگر بابا چاہتے ہیں تو ــ"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا مگر تمہیں بھی اظہارِ مسرت کرنا ہوگا۔ گویا تم کو ان چیزوں کا کوئی احساس نہیں بلکہ خوش ہو۔ دیکھو بیٹا ! کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تمہارے بابا بھی زندہ دلی سے زندگی گزاریں۔ ان کا بھی کوئی ساتھی ہو۔ تم سمجھدار ہو حماد !"

"جی تائی اماں : تائی اماں ! وہ کون ہیں جو کیسی ہیں ؟" اس نے آہستگی سے پوچھا۔

"ارجمند ــ ابا میاں کا خیال ہے۔ شاید تمہارے بابا کو بھی وہ ناپسند نہیں۔"

حماد کو گویا شاک سا لگا۔

"تائی اماں : باجی بابا سے تقریباً دس بارہ سال چھوٹی ہیں اور شاید اس سے بھی زیادہ۔"

"تو کیا ہوا ایڈی دیا نا بھی تو چالیس سے بارہ سال چھوٹی ہیں۔" ساجدہ نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر دلیل دی۔ وہ تو سب سے زیادہ خوش ہو رہی تھی۔

حماد نے اسے دیکھا بر ننڈ یوک والی شلوار اور کھلے تراشیدہ بالوں میں وہ خوشی سے گلنار ہو رہی تھی۔

"تم جو اتنی خوش ہو رہی ہو تمہیں کیا ملے گا ؟" وہ واپس اپنے موڈ میں آ گیا۔

"ہم مفاد پرست نہیں ہیں۔ ایسے بھی خوش ہو سکتے ہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے بولی۔

صبیحہ بیگم نے باری باری دونوں کو منہ بھر کر دیکھا اگر نظریں واپس موڑ لیں۔ مبادا اتنے پیارے بچوں کو نظر نہ لگ جائے۔

؎ خوابوں کا اِک شہر ہے آنکھوں کے سامنے
اس شہر کی تلاش میں صحرا مگر نہ ہو

جب ابا میاں نے ارجمند سے بات کی تو احساسِ مسرت سے اس کا انگ انگ گنگنا اٹھا۔ اس نے کبھی کسی مرد کا سایہ اپنے سر پر نہیں دیکھا تھا۔ باپ کو زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا تھا۔ علیحدگی کے بعد وہ اس سے ملنے نہیں بلکہ کسی کام کے سلسلے میں چاٹگام آئے تھے اور یوں اس پر بھی احسان کر دیا تھا۔ ارجمند نے جب بھی کبھی زندگی کے ساتھی کا تصور کیا وہ ایسا ہی تھا۔ سمجھدار، باوقار، سنجیدہ اور پختہ عمر کا۔ لڑکے ہمیشہ اسے بچکانے لگتے تھے۔ شوخیاں کرنے والے، کمن ــ لاپروا اور سطحی سے۔

اور پھر وہ کوئی بڑے خاندان کی نہیں تھی۔ اس کے آباؤ اجداد راجاؤں اور مہاراجوں کے ساتھی تھے۔

اس کی ماں کا تعلق کھشتری ذات سے تھا۔ اس کی ماں نے اس کی رگ رگ میں سمو دیا تھا کہ وہ کھشتریوں کی نواسی ہے۔ برہمنوں کی بھتیجی ہے۔ جن کے آباؤ اجداد کا اوڑھنا بچھونا ــ سونا چاندی اور جواہرات تھے۔ مغلوں کے دور میں بھی وہ عظیم الشان ریاست رکھتے تھے۔ البتہ انگریزوں کے دور میں ان کے خاندان پر برا وقت آیا۔ وہ ہندو تھے مگر دوسرے ہندوؤں سے مختلف۔ مسلمانوں نے انہیں بہت نوازا تھا۔ وہ احسان فراموش نہیں تھے۔ یہی وصف ارجمند کے حصے میں بھی آیا تھا۔ ابا میاں نے اس کی انہی باتوں کو ایک مرتبہ سن کر کہا تھا بیٹی ۔ اب صرف اس بات پر فخر کرو کہ تم مسلمان ہو۔ تمہارا دل مسلمان ہے۔"

انہیں اسے یہ احساس تو نہیں ہوا کہ وہ اس قابل نہیں ہے۔ مگر صرف یہ حیرانی تھی کہ وہاج حسین کیوں کر راضی ہو گئے۔ اسے ان کا تصور کر کے جھرجھری آ گئی۔ اس کے کان منتظر رہنے لگے کہ وہاج حسین کی کوئی بات چھڑے۔ اس کا دل کا بے تاب رہتا کہ بات بنتے بنتے بگڑ نہ جائے۔

مغرب کی نماز کے بعد ابا میاں بہو کے پاس بیٹھے کسی بات میں مصروف تھے۔ وہاج حسین تیزی سے اپنے کمرے سے نکلے آج سارا دن انہیں فرصت نہیں مل سکی تھی۔ اب وہ بھابی بیگم کے پاس آ رہے تھے۔ مگر ابا میاں کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

"آؤ وہاج ـــ تمہاری ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ بہت اچھا ہے اگر ایسا ہو جائے۔"

"بھابی بیگم ! میں یہی بات کہنے آیا ہوں کہ ـــ"

"وہاج میاں ! بس جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں دلہن سے رات کی بات

کر رہا تھا۔

"جی۔؟" وہ گھبرا سے گئے۔

"جاؤ میاں۔ اب مجھے مزید پریشان نہ کرو۔" ابا میاں کا لہجہ خشک ہو گیا۔

وہاج حسین جیسا باوقار انسان از حد شرمندہ ہو گیا۔ براؤن سوٹ چمکتی رسٹ واچ قرینے سے جمے بال تنا تنا جسم آنکھوں پر انتہائی باریک نفیس فریم کی عینک۔ شاید وہ پھر کہیں جا رہے تھے۔ ارجمند نے کھڑکی میں سے انہیں دیکھا۔ تو جی چاہا۔ ان کے پہلو میں جا کھڑی ہو۔ ان کا وجود محسوس کرے۔ ان کی خوشبو اپنی پور پور میں جذب کرے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اسے دیکھیں۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتی ہوئی باہر نکل آئی۔

نیلی سادہ مہین ساڑھی کا آنچل اس نے شانے پر پھیلایا اور ان سے چند قدم دور آ کر ٹھٹھک گئی۔ جھجک گئی۔ مزید آگے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ برقی بلب کی روشنی پوری اس کے وجود پر پڑ رہی تھی۔ سنگ مرمر پر نیلا رنگ منعکس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بے پناہ حسین چمکدار آنکھیں اٹھائیں۔

وہاج حسین نے صرف ایک لمحے کو اسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔

کل کی رات سے قبل اس کی ذات کے آئینے میں کوئی بال نہیں تھا۔ مگر اب۔ انہوں نے جیسے خون کا گھونٹ پیا۔

بھابی بیگم نے ارجمند کو دیکھا۔ "آؤ ارجمند۔ آؤ نا۔" وہ ابا میاں کو دیکھ کر آنچل سر پر ڈالتی ہوئی آگے بڑھی اور وہاج حسین پورٹیکو کی سمت بڑھ گئے۔

بھابی بیگم، ساجدہ کو لے کر لشتم پشتم بازار گئی تھیں۔ عروسی جوڑا اور ایک زیور کا سیٹ خریدا۔ ہم رنگ سینڈل تھوڑا بہت میک اپ۔ ابٹن۔ مہندی۔

ابا میاں کی سندھ میں کافی زمینیں تھیں جن سے سالانہ آمدنی بہت تھی۔ اور ابا میاں آج بھی بیٹوں کے محتاج نہ تھے بلکہ ان کا کھاتہ تو صبیحہ بیگم کے نام تھا۔ سارا حساب کتاب بہو کے ہاتھ میں تھا۔ اتنی فرمانبردار نیک اور خدمت گزار بہو کے وہ صحیح معنوں میں قدردان تھے۔ جنہیں ابا میاں کے سامنے صرف جی ابا میاں کہنا آتا تھا۔ ابا میاں کا جب جی چاہتا صبیحہ بیگم کو اپنے پاس بٹھا لیتے اور باتیں کرتے وہ انہیں بیٹوں کی طرح۔ بلکہ کہیں زیادہ عزیز تھیں۔

اب بھی وہ ان کے حکم پر بازار آئی تھیں۔ ساجدہ کو اپنی فکر پڑی تھی۔ "امی جی! میرا یہ، میرا وہ۔"

"دیکھو ساجدہ! یہ جیکٹ کتنا خوبصورت ہے۔"

"ہوں۔"

"حماد کے بالکل فٹ آئے گا۔"

"امی! اتنے تو کپڑے ہیں اس کے پاس۔ کالج کیا جاتا ہے۔ کپڑے دکھانے جاتا ہے۔"

"اچھا چپ کرو۔ تم تو اس سے بھی آگے ہو۔" پھر انہوں نے جیکٹ پیک کروالی۔

پھر اپنی اکلوتی بیٹی کو دیکھ کر بولیں جو قد میں ان سے بھی اونچی ہو رہی تھیں۔ "جگہ تو دیکھ لیا کرو ہر جگہ ضد شروع کر دیتی ہو۔"

جب وہ شاپنگ کر کے گھر آئیں تو ابا میاں بیٹیوں کے گھر چلے گئے۔

وہ کھانا کھا کر فارغ ہوئی تھیں کہ سلیمہ پھوپھو روتی بلکتی آ گئیں۔ ابا میاں شاید سعدیہ پھوپھو کی طرف تھے۔ منہاج حسین ٹی وی پر کوئی انگریزی فلم دیکھ رہے تھے۔ وہاج حسین ابھی نہیں تھے۔ ارجمند، ساجدہ بیگم اور صبیحہ بیگم تینوں پریشان ہو گئیں۔

"بڑے بھابی بیگم!" سلام و جواب کے بعد وہ شروع ہو گئیں۔ "میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ کیا میرے بھائی کے نصیب میں وہ بندلی ہی رہ گئی ہے۔ جس کا آگے کا پتہ نہ پیچھے کا۔" پھر وہ منہاج حسین کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"بھائی صاحب! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں ہوا مجھے۔" وہ مسکرائے۔ بے حد اعلیٰ ظرف انسان جو اکثر خوش گوار موڈ میں رہتے تھے۔

"ارے میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔" وہ تنتنی سے بولیں۔

"اگر وہاج خود چاہیں تب بھی۔" وہ مسکرائے۔

"میرے بھائی جان ایسے نہیں ہیں۔ ضرور اس کلموہی نے کچھ چکر چلایا ہے۔"

منہاج حسین یکایک سنجیدہ ہو گئے۔

"سلیمہ، خواہ مخواہ شور کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابا میاں نے کبھی کوئی کام غلط نہیں کیا۔ یہ میرا مشاہدہ اور تجربہ ہے اور پھر اب وہ مسلمان ہے۔ وہ اس قدر اچھی لڑکی ہے سلیمہ کہ یہاں۔ دور دور اس جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کی نگاہ میں حیا ہے۔ سلیمہ! جب ہم نے اسے اپنے گھر رکھا تو سب نے ہی کیا کیا نہیں کہا۔ مگر ابا میاں ٹھیک کہتے ہیں۔ لوگوں کے ڈر سے بھلائی کرنے سے رکنا نہیں چاہیے۔ اور سلیمہ اب تو ہمیں بھی اندازہ ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں بھلائی کرنا کس قدر دشوار عمل ہے۔ لوگ اپنے اعمال سے ہراساں اور پریشان ہو چکے ہیں۔ وہ سب کو اپنے جیسا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ وہ خود کو تسلی دے سکیں کہ سب ہی ان جیسے ہیں۔ جہنم میں گریں گے تو کیا؟ لائن لگا کر گریں گے۔

سلیمہ! ابا میاں جیسے منفرد انسان کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے دو۔ وہ جس مقام پر پہنچ گئے ہیں اور آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ان کے راستے دشوار نہ بناؤ۔"

انہوں نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا اور بیوی سے کہہ کر کہ سلیمہ کو چائے وائے پلاؤ۔ باہر چلے گئے۔

ے طرب زار دل پہ کیا بیتی؟ صنم خانوں پہ کیا گزری؟
دل زندہ! تیرے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری؟

بھابی بیگم عروسی جوڑا نہیں بلکہ عروسی ساڑھی لائی تھیں۔ بس انہیں بھا گئی تھی۔

چیدہ چیدہ لوگوں کو دعوت دے دی گئی تھی۔ گھر میں ہڑبونگ مچ رہی تھی۔ ساجدہ نے تربوزی رنگ کا آٹھ کلی کا کرتا پہنا تھا۔ جسے دیکھ کر حماد نے کہا تھا۔ ایک تو ویسے ہی پھیلتی جا رہی ہو پھر اس پر کپڑے ایسے پہنتی ہو کہ بارہ من کی دھوبن لگتی ہو۔ آف وائٹ کلر کے شلوار قمیص اور تائی اماں کی لائی ہوئی جیکٹ میں ملبوس وہ شرارت سے مسکراتا بڑا سندر لگ رہا تھا۔

"ہونہہ! اتراتا ہے۔" وہ جل کر رہ گئی تھی۔

اس نے چچی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ سہیلیوں کی طرح چھیڑ چھاڑ بھی کی تھی۔

"چچی جان! یہ کورامین آپ کے پرس میں رکھ رہی ہوں۔ بے ہوشی کا توڑ ہے۔" اس نے شرارت سے ہنس کر کہا تھا۔ تب ارجمند بری طرح شرما کر رہ گئی تھی۔

کیسا پیارا وقت اور خوبصورت گھڑیاں ابا میاں نے اس کی جھولی میں ڈال دی تھیں مگر وہ سسک پڑی کہ تدبیر بہت کم تقدیر کا ساتھ دیتی ہے۔

صبح اس کی آنکھ بہت جلد کھل گئی تھی حالانکہ رات کو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔ وہ ناشتہ کر کے لیٹی ہوئی تھی کہ ساجدہ اندر آئی۔

"چچی جان! آپ کون ہیں بھلا؟"

ارجمند چونک گئی پھر آہستگی سے بولی۔ "ارجمند۔"

"ہا ہا۔" ساجدہ ہنسی۔ "جی نہیں۔ پاکستانی۔"

"چچی جان! آپ تو پہلے بھی پاکستانی تھیں۔ دیش بننے سے پہلے وہ بھی ہمارا پاکستان تھا نا۔ پتہ ہے کیا۔ مجھے اپنے وطن سے پاگلوں کی طرح محبت ہے۔ میرا جی چاہتا ہے دنیا میں پاکستان سے بڑا کوئی نہ ہو۔ دراصل صبح ابا میاں کہہ رہے تھے کہ ارجمند اب پاکستانی شہری ہیں۔ کراچی کی شہری ہیں۔ میرے چچا کے دل کی شہری ہیں۔" وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔ اس نے ساجدہ کے ہنستے ہوئے چہرے کو دیکھا اور افسردگی سے سوچا۔ "نہیں ساجدہ! تمہارے چچا کے دل کا علاقہ غیر ہوں۔"

"کیا بات ہے؟ آپ خاموش ہیں۔" اس نے ارجمند کو بغور دیکھا۔

"ارے نہیں۔ بس نیند آ رہی ہے۔" تب ساجدہ اٹھ آئی تھی۔ مختصر سی دعوت ولیمہ کا اہتمام شام سات بجے تھا۔ وہ بے خبر پڑی سوتی رہی۔

اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی تھی لائٹ کی وجہ سے۔ اس کی نگاہ سامنے گئی۔ وہاج حسین سگار منہ میں دبائے کوئی کتاب دیکھ رہے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ دروازہ بند تھا۔

اس کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ کب آئے؟ جانے کیا وقت ہوا ہے۔

وہاج حسین کا کمرہ اسی طرح سادہ تھا۔ جیسا پہلے تھا۔ کوئی سجاوٹ نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے وہاج حسین کو دیکھ رہی تھی۔ اسی دم دروازہ بج اٹھا۔ وہاج حسین اپنی کرسی سے اٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے سعدیہ تھیں۔

"بھابی کو تیار کرنا ہے۔ کچھ لوگ آ چکے ہیں۔ انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ طبیعت کیسی ہے؟" انہوں نے اندر آتے آتے کئی سوال کر ڈالے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ارجمند سعدیہ سے بہت چھوٹی تھی۔ مگر اب رشتہ بڑا تھا۔

"چلیں بھابی۔ نہا دھو لیں۔ ساجدہ کپڑے وغیرہ لا رہی ہے۔ کھانا لاؤں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ غسل کر کے سبز نقرئی کام کا غرارہ سوٹ پہن کر باہر آئی تو سب لڑکیاں ٹھٹھک گئیں اس نے غرارہ پہلی مرتبہ پہنا تھا۔ جو بے حد سج رہا تھا۔

وہاج حسین اب بیڈ پر دراز تھے۔ کتاب ان کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے دل میں خواہشیں جاگ اٹھیں۔

کاش وہ ایک لاڈلی نازاٹھوانے والی دلہن بن سکتی اور ناز سے یہ رقیب روسیاہ کتاب ایک طرف ڈال دیتی لے کر مگر ۔۔ اب ایسا لگتا ہے کہ میں تو ان کی قمیص پر چلتی چیونٹی بھی چٹکی میں نہیں پکڑ سکتی۔ وہ حوصلے اور جراتیں کہاں۔ ابا میاں یہ تو اتنے بڑے ہیں ان کے ساتھ زبردستی کیونکر ہو گئی۔ مجھے تو ان کی رات کی باتیں بھی سمجھ میں نہیں آئیں۔"

سعدیہ پھوپھو کا بڑا بیٹا کیمرہ لے کر اندر آ گیا۔ ساجدہ، اور آسیہ؛ ارجمند کو سجا چکی تھیں۔

اسی دم ۔ صبیحہ بیگم بھی اندر آ گئیں۔ "ہاں بچے! ذرا اپنے ماموں ممانی کی الگ سے تصویر بنا لو ۔" ادھر آ جاؤ وہاج! ادھر صوفے پر۔" اور انہیں ناچار اٹھنا پڑا۔

پھر آسیہ اور ساجدہ نے ارجمند کو ان کے پہلو میں لا بٹھایا تو وہ ذرا سے ایک طرف ہو گئے۔

"شاید ممانی نے ماموں جان کے چٹکی کاٹ لی ہے۔" آسیہ نے سرگوشی کی۔ ساجدہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"امی! چچا جان سے کہیں چچی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک تصویر بنوائیں۔"

"اے ۔ ہاں ۔ لو بھلا میں کہوں گی؟" وہ بیٹی کی غیر معقول بات پر تھوڑی سی جز بز ہو کر بولیں۔

کئی تصاویر بنیں۔ صبیحہ بیگم نے بھی دیور دیورانی کے ساتھ بیٹھ کر بڑے اہتمام سے تصاویر بنوائیں۔

"جاؤ ساجدہ! اپنی تینوں پھوپھیوں کو بھی بلا لاؤ۔"

زرق برق لباس پہنے لڑکیاں دونوں کو بے حد اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ صبیحہ بیگم دیور کے انداز کو خوب دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ارجمند کو دیکھا۔

جیت جانے کی کوئی علامت اس کے پاس نہیں تھی۔ انہوں نے لڑکیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود یہ کہہ کر کہ جب سب مہمان آ جائیں گے تو بلوا لوں گی۔ ویسے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں وہاج۔

"وہاج!" ارجمند نے چونک کر وہاج حسین کو دیکھا۔

"انہیں کیا ہوا۔"

صبیحہ بیگم دروازہ بند کر کے نکل گئیں۔

اور وہاج حسین شکستہ سے قدموں سے بیڈ کی سمت بڑھے مگر وہاں ارجمند کا میک اپ کا سامان چوڑیاں اور خوشبویات بکھری پڑی تھیں۔ وہ آگے بڑھ آئی اور چیزیں اٹھا اٹھا کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنے لگی۔ وہ یہ عمل خاموشی

سے دیکھنے لگے۔ اسی دوران اس کے ہاتھ میں سنہرا قلم آ گیا۔ اس نے سیدھی ہو کر ان کی سمت بڑھایا۔ چھن چھن، چوڑیاں بج اٹھیں۔

انہوں نے ایک نگاہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر ڈال دی۔ ایک جوان اور حسین عورت بیوی کے روپ میں قریب ہو۔ انسان ایک نگاہ بھی نہ ڈالے کس قدر غیر فطری سی بات ہے۔

ایک خوبصورت نفیس خوشبودار مرد شوہر کے روپ میں سامنے ہو اور عورت کا دل نہ چاہے اس کو روح میں اتارنے کا کس قدر غیر فطری بات ہے۔

انہوں نے قلم ہاتھ میں لے لیا اور بیڈ پر دراز ہو گئے۔ ان کا بازو ان کی آنکھوں پر تھا۔

اس نے قلم پاؤڈر کا ڈبہ چیک کر اٹھانا چاہا تو گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہار خوشبو دے اٹھے ۔۔۔ وہاج حسین ان خوشبوؤں سے خوف زدہ تھے۔ بیس سال پہلے کی خوشبو ان کو زندگی دینے کے بجائے ان کے گلے پر پھندا کس رہی تھی۔

"غالباً آپ کو تو اس وقت باہر مہمانوں میں ہونا چاہئیے۔" انہوں نے بازو آنکھوں پر سے ہٹا کر سرد لہجے میں کہا۔

"نہیں ۔ زندگی ۔ مجھے تو تمہارے دل میں ہونا چاہئیے۔" اس کا دل پسور نے لگا۔

"مجھے تمہاری روح کے سمندر میں غوطہ زن ہونا چاہئیے ۔"

اس نے اس معصفا، اجلے شخص کو نظر بھر کر دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ چوتھی کی دلہن شرمیلی ہوتی ہے۔ تھکی ہوئی ہوتی ہے۔ رات کو ساجن کا سہارا لیتی ہے۔ دن کو سکھیوں کا۔ وہ اکیلی باہر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ بلاوے کے انتظار میں بیٹھ گئی۔

؎ ساحل پہ لائے اور سفینے ڈبو دیے
یوں زندگی نے ہمیں ہنسایا کہ رو دیے

وہاج حسین رشتے میں سرد تھے مگر بھڑک اٹھنے والوں میں سے نہیں تھے۔ دونوں کمرے میں ہونے کے باوجود دو دو گھنٹے اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے مگر وہ اس پر کوئی طنز یا کاٹ نہیں کرتے تھے۔

وہ ساجدہ سے اردو پڑھ رہی تھی۔ ہندی، بنگلہ اور انگریزی وہ لکھ لیتی تھی۔ مگر اردو لکھنا نہیں آتی تھی۔ رات کو دیر تک لکھنے کی مشق کرتی۔ عشا کی نماز ادا کرتی۔ ان کے کپڑے تیار کرتی۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولتے حتیٰ کہ وہ چار ہاتھ کے فاصلے

پر جا لیٹتی۔ وہ رخ موڑے اسی طرح مطالعے میں مصروف رہتے۔

اور پھر ان کی خاموشی کھل گئی۔ راز آشکارا ہو گیا۔

"ابا میاں! میں فرم کی طرف سے باہر جا رہا ہوں۔"

"ارجمند بٹیا بھی جائے گی؟"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے فی الحال نہیں۔"

"روزی کا معاملہ ہے میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں۔ خدا تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

اور وہ منہ چھپائے سسک سسک کر روتی رہی کہ حقیقت صرف اسے معلوم تھی۔

وہ اپنا سامان تیار کر رہے تھے۔ ارجمند ان کا ہاتھ بٹا دیتی۔ وہ کچھ نہ بولتے۔

رات کی فلائٹ تھی مغرب کے بعد گھر سے نکل جانا تھا۔ سب لوگ انہیں سی آف کرنے جا رہے تھے۔ سوائے ابا میاں کے۔

ارجمند نے آف وائٹ سیاہ بارڈر کی ساڑھی جس پر سنہری کام بنا تھا باندھی تھی۔ جو ساجدہ نے بعد اصرار اسے پہنائی تھی۔

"آج تو چچا جانی کو بھر پور جلوہ دکھا دیں پھر جانے کب ملیں یہ تب وہ افسردگی سے مسکرا دی۔ حماد کا کوٹ استری کر کے وہ کمرے میں چلی آئی۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ٹائی باندھ رہا تھا۔

"ارے باجی! آپ تو مجھ سے پہلے تیار ہو گئیں۔" وہ مسکرایا۔ اور کوٹ پہننے کے لیے بازو پھیلا دیے۔ ارجمند نے اسے کوٹ پہنانے میں اس کی مدد کی۔ پھر اس کے کوٹ پر برش کیا۔

"باجی! بابا نے تو آپ کو بالکل اپنے جیسا بنا دیا ہے۔ مسکراتی تک نہیں ہیں۔"

وہ پھیکی سی ہنس دی۔ "چلو چندا! سب تیار ہیں۔" وہ یہ کہہ کر باہر آ گئی۔

ڈرائیونگ وہاج حسین کر رہے تھے۔ ظاہر ہے اسے آگے بیٹھنا پڑا۔ منہاج حسین کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ کہہ گئے تھے ایئرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔ سارے راستے حماد اور ساجدہ کی نوک جھونک چلتی رہی اور وہ نہ جانے کہاں گم رہی گیئر بدلتے ہاتھوں کو تکتی رہی۔

پھر آخر کار آخری بار ملنے وہاج حسین ان سب کے قریب آئے۔ الوداعی کلمات کہے اس کے پاس ۔۔۔ دیر رکے پھر گویا ہوئے۔ "خدا حافظ!" اور مڑ گئے۔ مڑنے سے پہلے حماد کو ایک مرتبہ مزید گلے سے لگایا۔

؎ چھپا سکا نہ تجھ کو تو کھو دیا خود کو
یہ میرا عجز بھی ہے یہ میرا کمال بھی ہے

اب بھی وہی گھر اور وہی رونقیں تھیں مگر وہ بہت بجھ کر رہ گئی تھی۔ رات کو جب بے قراری بہت بڑھتی تو جائے نماز باہر گھاس پر بچھا لیتی۔ اس جائے نماز پر پہلا قدم پڑتے ہی اسے یوں محسوس ہوتا وہ بہت پرسکون اور محفوظ ہے۔ اس نے ساری زندگی یہ سکون کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ غافل ہو جاتی۔ سجدہ میں سر رکھ کر دعا مانگتی۔

"اے نور! اے میرے دل میں رہنے والے خدا تو تو روز اول سے میرا تھا۔ یہاں تھا۔ مجھے سکون دے۔ جو میں نے نہیں کیا اس کی سزا نہ دے۔ اے کائنات کے بادشاہ! خواہشات کو اتنا پیچھے ہٹا کہ میں تیری جانب بھاگوں اور یہ میرے پیچھے۔ اس سے قبل کہ یہ مجھے آ دبوچیں تو مجھے اپنے نورانی وجود میں چھپا لے۔ اے خدا! تو مجھ پر حاوی رہ ۔ میرے ہاتھوں پر میری آنکھوں پر حتیٰ کہ جب سو جاؤں تو مجھے خواب دکھائی نہ دیں۔ صرف آوازیں ہوں کہ۔ خدا یہاں ہے۔ دل میں ۔ وجود میں تیری نورانی صدا سنوں۔ کہ میں تیرا ہوں تجھ پر سائبان ہوں۔"

روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

شام کو وہ لان میں ابا میاں کے پاس جا بیٹھتی اور خاموشی سے خلاؤں میں تکتی رہتی۔

ابا میاں چھڑی اٹھا کر زمین ٹھوکتے۔ "میری بیٹی! سب ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ چونک کر ابا میاں کی شکل دیکھتی۔ "ابا میاں! دل میں تو خدا ہے آپ تو نہیں۔" اور ابا میاں کی ایسی میٹھی وجدانی باتوں پر اس کا جی چاہتا۔ وہ ان کے استخوانی وجود میں خود کو سمو کر پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ ابا میاں سب کچھ مل کر بھی سب کچھ کیوں نہیں ملتا؟

پھر وہ ابا میاں کے ساتھ کھڑی ہو کر مغرب کی نماز ادا کرتی۔ دل سکون سا پانے لگتا۔ ابا میاں ضعیف تر ہو چلے تھے۔ نماز گھر پر ہی پڑھنے لگے تھے۔

رات کو وہ خاموش بیٹھی ہوتی تو آ کر اس کے بستر پر بیٹھ جاتے۔ "بیٹی ۔ یا الحفیظ کی تسبیح کیا کرو۔ تمام تدبیریں سے نگاہ اٹھ کر خدا پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ پھر مدد کی ہر کرن وہ

بھیجتا ہے۔"

اور وہ آنسو چھپانے لگی۔ "کیا ہیں ابا میاں۔ مالک! تیرا نور ان کے پاس زیادہ آ گیا ہے۔؟"

ابا میاں بیمار رہنے لگے تھے۔ وہ رات کو دوا پلا آتی۔ اس نے بھابی سے چارج لے لیا تھا۔ انہیں دوا پلا کر آئی اور وہاج حسین کی تصویر پر نگاہ پڑتے ہی اس کی دنیا ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ وہ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ جائے نماز بچھانے لگی تو رک گئی اور ابا میاں کے کمرے کی طرف آ گئی کہ سوئے یا نہیں۔ وہ ... چوکی پر بیٹھے تھے۔ اشارے سے اسے بلایا۔

وہ چلی آئی۔ کمرے میں ہلکی سبز روشنی بکھری تھی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ بوڑھا۔ ٹھنڈا ہاتھ۔

"میری بچی! اس قدر پریشان کیوں ہے؟ کیوں بھرتی ہے اس طرح راتوں کو؟"

اور ارجمند سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ بیٹھ گئی اور ان کے کاندھے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ابا میاں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ آخر وہ رو رو کر تھک گئی۔ نیم جاں ہو گئی۔

"میں نے دونوں کا بھلا چاہا تھا۔ تو غمگین نہ ہو۔ وہ تیرا ہے۔ آئے گا ضرور آئے گا۔ میں نے تجھے بہت درس دیے۔ صبر کا نہیں دیا۔ سن بیٹی! جو صبر کرتے ہیں، کائنات ان کے پاؤں کے نیچے آ جاتی ہے جو صبر سے ملتا ہے دیرپا ہوتا ہے۔ اس کی قدر ہوتی ہے۔ خوشی ہوتی ہے۔ میں نے استخارہ کر کے یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ نادان ہے مگر کل قدر دان بنے گا۔ اس قدر نہ رویا کر۔ ایک انسان کے لیے۔ یہ آنسو خدا کے لیے بہایا کر تو خدا کی ہو وہ تیرا ہو گا اور جس کا خدا ہوتا ہے پھر سب کچھ اسی کا ہوتا ہے۔ کل سے خوف زدہ نہ ہو۔ کل تو تیرا ہے میری بیٹی!"

ارجمند کے آنسو رک گئے۔ روح توانا ہو گئی۔ وہ شرمسار ہو گئی۔

"ابا میاں! آپ سب کچھ کیسے جان لیتے ہیں۔ آپ کیا ہیں ابا میاں۔" وہ سوچتی رہ گئی۔

؎ حوصلہ دیکھ لیں ہم بھی سرِ خرمن اپنا
اور باقی ہے کوئی شعلۂ تدبیر کہو؟

وہاج حسین اسے اور اپنے بیٹے کو رقم بدستور بھیج رہے تھے — اسے کوئی خط نہ لکھا تھا۔ مگر اس کے دل نے ایسا قرار پکڑ لیا تھا کہ عجیب مطمئن سی ہو گئی تھی۔

ابا میاں شدید علیل ہو گئے تو وہاج حسین کو بلوا بھیجا۔ اور وہ جو کبھی نہ آنے کا تہیہ کر کے گئے تھے۔ رواں چلے آئے۔

پھر وہی سالم گول دنیا کا چکر مکمل کر کے آ گیا۔

وہ ابا میاں کو دوا پلا کر واپس آئی تو بیل بج اٹھی۔ اس نے خانساماں کو دروازہ کھولنے کو کہا اور خود کھڑی ہو کر دیکھنے لگی کہ کون آیا ہے۔

بھابی تو حسبِ عادت جلدی سونے جا چکی تھیں حماد سعدیہ پھوپھو کے ہاں ایک دن کے لیے گیا تھا۔ ساجدہ پڑھ رہی تھی۔ سلیمہ پھوپھو بھی ابا میاں کی علالت کی وجہ سے آئی ہوئی تھیں۔

اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ بغیر کسی اطلاع کے سامنے وہاج حسین تھے۔ خانساماں نے خوش ہو کر سلام کیا۔

"السلام علیکم!" اس نے بھی آہستگی سے کہا۔

"وعلیکم السلام!" انہوں نے سفید لینن کی چادر (جو وہ نماز کی وجہ سے اوڑھے ہوئے تھی) میں لپٹی سادہ سی ارجمند پر ایک نظر ڈال کر جواب دیا جس کا دل ٹھکانے نہیں تھا۔

اس نے ان کے ہاتھ سے بیگ اور بریف کیس لے لیا۔ کمرے میں آ کر انہوں نے کوٹ اتارا۔

"کیا ابا میاں جاگ رہے ہیں؟"

"جی۔"

انہوں نے ٹائی کھول کر بستر پر پھینکی اور باہر چلے گئے۔

وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔

دونوں آگے پیچھے ابا میاں کے کمرے میں داخل ہوئے۔

بیٹے کو دیکھ کر وہ فرطِ مسرت سے بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے۔

"السلام علیکم ابا میاں!" انہوں نے باپ کے نحیف و نزار ٹھنڈے ہاتھ تھام لیے۔

"وعلیکم السلام بیٹا! خدا دین و دنیا میں تمہارا بھلا کرے! کیسے ہیں آپ؟ میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔"

"مہمان ہیں بیٹا۔ تم اس گھر کے میزبان ہو۔ مہمانوں کو رخصت کرنا میزبانوں کا فرض ہوتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

ارجمند کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔

"خدا نہ کرے ابا میاں! آپ کے بدلے میں چلی جاؤں۔ میرا کیا ہو گا؟"

"ارے ابا میاں! بیماریاں تو آتی رہتی ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے آپ۔" انہوں نے محبت سے باپ کا ہاتھ سہلایا۔ ابا میاں مسکرا دیے۔

"وہاج! یہ میری بیٹی ہے۔" انہوں نے ارجمند کی سمت اشارہ کیا۔

وہاج حسین خاموش رہے۔

"بڑی دلہن — انہوں نے ساری زندگی میری خدمت کی۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔ میری بہوئیں قابلِ رشک ہیں۔ میرے بیٹے میری دل سے عزت کرتے ہیں۔ عورتوں کی عزت کرنا مرد کی بلندی ہے۔ مرد کی رفعت ہے میرے بیٹے! اور اتنی اچھی عورتیں۔ بیٹے! ان کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔ تیرے بیٹے! یہ بچی ہے سہارا تھی۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ یہ میری ہو گئی۔ اس کا دل حساس ہے بہت زیادہ۔ تم کبھی اس کو اپنے احسانات یاد نہ دلانا۔ کہ تم نے مایہ منی تھے رب العالمین نے تمہیں کشادہ گھر اور فراخ رزق دیا۔ احسان صرف اس کا ہوتا ہے۔" انہوں نے انگلی چھت کی طرف اٹھائی۔

"وہاج — میرے بیٹے — دل دکھانے کا عمل بہت قبیح ہے۔ ہر چیز کا علاج ہے مگر دکھے دل کا نہیں۔ ایک بار دل دکھ جائے تو عمر بھر مداوا نہیں ہوتا۔

میرے بیٹے! باپ کی بیماری کا سن کر سات سمندر پار سے چلے آئے۔ میرے ہی نہ ہو سب کے ہو سب کے —"

ابا میاں اپنے پختہ عمر بیٹے کو اس طرح سمجھا رہے تھے۔ جیسے وہ اسکول کے بچے ہوں۔

وہاج حسین گردن ڈالے بیٹھے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں — گھبراؤ نہیں۔ جاؤ کھانا وانا کھاؤ۔"

"بیٹی! کھانے پینے کو نہیں پوچھا؟" وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

"ابا میاں! یہ فوراً ہی آپ کی طرف چلے آئے۔" وہ شرمندگی سے بولی۔

"کھانا کھا لیا تھا میں نے۔"

اسی دم بھابی بیگم، سلیمہ پھوپھو، ساجدہ، منہاج حسین اندر داخل ہوئے۔ گویا خانساماں نے اطلاع دے دی تھی۔ وہاج حسین نے سلام کیا۔ منہاج حسین سے گلے ملے۔

"واہ یار — بغیر کسی اطلاع کے۔" انہوں نے ان کی پشت تھپتھپائی۔

"بس سیٹ جلدی مل گئی چلا آیا۔ یہ حماد کہاں ہے؟"

"ارے ہائے — بھائی جان کس قدر کمزور لگ رہے ہیں۔ سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہو گا۔"

سلیمہ پھوپھو نے لاڈ سے کہا۔ "ہاں — حماد سعدیہ کے ہاں گیا تھا کل۔"

"ہم نے تو کہا تھا ارجمند کو بلوا لیں۔" بھابی بیگم ہنسیں اور ابا میاں کے پاس بیٹھ گئیں سلیمہ پھوپھو کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ انہوں نے بیزاری سے ارجمند کو دیکھا اور پھر بھائی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ "شکر ہے آپ آ گئے۔ ابا میاں تو بہت یاد کر رہے تھے۔"

کافی دیر سب ابا میاں کے پاس بیٹھے رہے۔ ابا میاں نے احساسِ ممنونیت سے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کا احساسِ ممنونیت خدا کے لیے تھا۔

؎ اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے، کیا رہائی ہے

آج پھر دوریوں کے ہمراہ وہ اس کے پہلو میں تھے۔ اسے ایک پل قرار نہ تھا۔ ان کے خیال سے وہ کروٹیں بدلنے سے بھی مجبور تھی۔ اس کا جی چاہا وہ انہیں جھنجھوڑ ڈالے یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب؟ یہ کونسا مقتل رشتہ ہے؟ یہ کونسی مجبوری کا تعلق ہے؟

مجھے یہ سرابوں کی مار مت مارو۔ مجھے رشتوں کی مار مت مارو۔ مجھے خاموشی کی مار مت مارو۔ میں رشتوں کی ڈسی ہوئی ہوں۔

وہ پہلے دھرم کا رشتہ جو میری تخلیق کے ساتھ مذاق تھا۔ اب اس مذہب کا رشتہ جو مجھے نورانی جھلک دکھا دکھا کر خوش امیدی کے میدان میں دوڑائے جا رہا ہے روح اڑنا چاہتی ہو گی۔ پرواز کرنا چاہتی ہو گی۔ مگر فی الحال اس خاکی برتن میں بند ہے۔ یہ خاکی وجود تھکتا بھی ہے۔ روتا ہے۔ اور تڑپتا بھی ہے۔

مجھے ضرب مارو۔ میرا وجود مٹی ہے تم اسے وجود کی

مار مار دو۔ مجھے لہولہان کردو۔
گر خدارا مجھے پکارو۔ مجھ سے بات کرو۔ مجھ سے کلام کرو۔ میرا نام لو۔
مجھ سے نفرت سے بات کرو حقارت سے بات کرو۔ مگر مجھ سے بات کرو۔
یوں ہی کہہ دو۔ میں تیرا ہوں۔ مگر تیرا نہیں ہوں۔
باپ کے سائے سے محروم رہی۔ ملال رہا۔
ماں مر گئی۔ دل تڑپتا رہا۔
ایک ایک کر کے سہارے چھوٹے۔ زندگی تنگ لگی۔ مگر ایسی کبھی نہیں لگی۔ جیسی اب ہے۔ جیسی اب لگی ہے۔
عورت سب سے زیادہ اہمیت اپنی زندگی میں اپنا بن جانے والے شوہر کو دیتی ہے۔
وہ کسی سے اتنی بے تکلف نہیں ہوتی۔ جتنی اپنے مرد سے ہوتی ہے۔
جو بات کسی سے نہیں کہتی وہ اپنے مرد سے کہتی ہے۔ دیکھو کتنا کچھ کہنا باقی ہے۔ تم نے بھی تو بہت کچھ کہنے کو سوچا ہوگا۔ ثریا بیگم سے تم نے دو سال میں کتنا کہہ دیا ہوگا!
تم پاتال ہو کہ ہر شے اس میں گر جاتی ہے۔ تمہارے پاس کچھ نہیں بچتا۔
تم بھٹی ہو کہ ہر چیز گر کر بھسم ہو جاتی ہے! کہ کہنے کو کچھ نہیں رہتا۔ ختم ہو جاتا ہے۔
اس کے آنسو اس کے چہرے کو بھگوتے رہے۔ تب وہ اٹھ بیٹھی باتھ روم میں جا کر وضو کیا۔
جائے نماز اٹھا کر باہر برآمدے میں آگئی۔ آج وہ پوری شدتوں سے خدا سے مخاطب ہونا چاہتی تھی۔ اس نے جائے نماز بچھائی۔ نفل کی نیت باندھ لی۔
وہ گم ہو گئی۔ بے خبر ہو گئی۔
"تو ہمارا ہے۔ دے مجھے آج سکون کی نیند۔ مجھے بھی وہی نورانی حصہ ملے جو ابا میاں کو مل گیا ہے کہ میں بھی ان کی طرح بے نیاز ہو جاؤں۔
اے خدا!" وجود کے کونے کونے سے کھینچ کر اس نے خدا کو محسوس کیا۔
اس کی آنکھوں میں جھلملاہٹیں تیر گئیں۔ اس نے اپنا وجود پھول کی طرح ہلکا محسوس کیا۔ نورانی ہگولے اسے آس پاس ناچتے محسوس ہوئے۔ اور اس محسوسات سے اس کا دل خوف سے کانپنے لگا۔ ایک عجیب سے خوف کا احساس

ایک سرد لہر سی کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گیا۔ دل دھڑ دھڑ بجنے لگا۔ جسم کا رواں رواں کھڑا محسوس ہوا۔ مگر بھاگنے کو پھر بھی جی نہ چاہا۔ ایک خوبصورت ٹھنڈک کا احساس اسے تھپکیاں دینے لگا۔
"بی بی۔ بی بی۔!" اسے کہیں دور سے ہاجرہ کی آواز سنائی دی۔
"بی بی! بی بی!" کسی نے اسے بلایا۔ وہ جاگ گئی۔
وہ ابھی تک جائے نماز پر سجدے کی حالت میں تھی۔ اس کے پاؤں سن ہو چکے تھے۔ ہاتھ جھنجھنا رہے تھے۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہاجرہ۔ شاید میں سو گئی تھی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔
وہ پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ سنسناہٹ کی وجہ سے حرکت بھی محال لگ رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد سنسناہٹ ختم ہو گئی۔ وہ جائے نماز تہہ کرتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے وہاج حسین سو رہے تھے۔ اس نے فجر کی نماز ادا کی اور ہاجرہ کو ایک کپ چائے کا کہنے باہر چلی گئی۔ ابا میاں صبح چائے نہیں پیتے تھے خالی پیٹ۔ اسے پتہ تھا کہ وہ جاگ رہے ہوں گے۔ وہ انہیں دیکھنے چلی آئی۔
وہ قرآن کی تلاوت میں مصروف تھے۔ وہ ان کا بستر ٹھیک کرنے لگی۔
تھوڑی دیر بعد ابا میاں کی آواز آئی۔
"ارجمند بیٹی! تم کس وقت سوتی ہو؟"
"وہ ابا میاں! سو کر ہی تو آ رہی ہوں۔" وہ جھینپ گئی۔
"تم میری اس قدر فکر کیوں کرتی ہو۔ تھک جاتی ہو گی۔"
"تو کیا نہیں کرنا چاہیے ابا میاں؟" اس نے سادگی سے سوال کیا۔
"اس قدر اپنے آپ کو پریشان نہ کرو۔ میں شرمندہ ہو جاتا ہوں بیٹی!"
اسے ابا میاں کے ناتواں وجود پر ٹوٹ کر پیار آگیا۔
"بہت جاندار ہوں ابا میاں! ہٹی کٹی۔ اتنی آسانی سے نہیں تھکتی۔" اس نے شگفتگی سے کہا۔ "آئیے ابا میاں! باغ میں چلیں۔ بہت پیاری ہوا ہے۔"
ابا میاں چپل ٹٹولنے لگے۔ اس نے آگے بڑھ کر چپل آگے کی۔ انہیں سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اور اپنا بازو ان کے شانے پر ٹکا کر آہستہ آہستہ باہر لان میں لے آئی۔

ایک عجیب سا سکون اور بے فکری کا احساس اس کے وجود پر چھا گیا تھا۔ وہ دل سے مسکرا رہی تھی۔ ابا میاں سے ہلکے پھلکے مذاق کر رہی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے اور اس کی خوشی پر خوش ہو رہے تھے۔
دوپہر کو ابا میاں کی حالت بہت بگڑ چلی تھی۔ ڈاکٹر آیا۔ انجکشن دیا گھر بھر میں سوگواری کی فضا چھا گئی تھی۔ مگر شام ڈھلے ان کی حالت سنبھل گئی تھی ڈاکٹر آچکا تھا۔ ساجدہ اپنے دادا جان کے پاس سے ہل کر نہیں دے رہی تھی۔
گھر کا نظام بدستور تھا مگر ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ رات گئے سب آرام کرنے چلے گئے۔ ابا میاں کی طرف سے مطمئن ہو کر۔ مگر وہاج حسین اپنے کمرے میں نہیں آئے تھے۔ گویا وہ ابا میاں کے پاس تھے۔ رات سے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ اس پر کوئی بوجھ نہیں۔ ہر سو طمانیت ہے۔ دل میں بے اندازہ سکون تھا۔ عجیب سی بے نیازی سی تھی۔ وہ باہر نکل آئی۔ وہاج حسین کا سوچا تو دل نے کہا۔ وہ میرے ہیں۔ میرا دل کہنے لگا ہے وہ میری جانب اب جلدی آئیں گے۔ کہ میرا مددگار پروردگار حقیقی ہے۔ میرے ابا میاں اچھے ہو جائیں بس۔
وہ سرخ پلین ساڑھی کا آنچل سنبھالتی ابا میاں کے کمرے کی سمت آئی مگر ٹھٹھک گئی۔ وہاج حسین کے لبوں پر ارجمند کا نام تھا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔
"وہاج بیٹے! وہ میرے اس قدر قریب ہو گئی تھی کہ میں اسے آسانی سے پڑھنے لگا تھا۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس کی عادتیں، اس کی شرافت اس کی حساسیت۔ تابعداری ایسی چیزیں ہیں جو آج کل کی لڑکیوں میں عنقا ہیں۔ میں اسے کیا سمجھتا ہوں کیسے بتاؤں۔ وہ جو ایک اجنبی لڑکی تھی آج مجھے عزیز ترین ہے۔ وہ بہت اچھی ہے۔ اسے پریشان نہ کرو۔"
"ابا میاں!" وہاج حسین کی خفا خفا سی آواز ابھری۔ "میں کوئی کھلنڈرا نوجوان نہیں تھا۔ مجھے اپنی توہین نہیں ہوتی۔ میں آج بھی کہہ رہا ہوں۔ مجھے غلط سمجھا گیا تھا۔ آپ کو بھی میری عمر دیکھ کر میری بات پر اعتبار آ جانا چاہیے تھا۔"
"جو تم مجھ سے کہنا چاہتے ہو مجھے علم ہے۔ مجھے سب علم ہے۔ مجھے معاف کرنا۔ میں نے یہ سب جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں نے تمہاری اور ارجمند کی پوری گفتگو سن لی تھی۔ مجھے صبیحہ دلہن سب کچھ بتا چکی تھیں۔" ابا میاں کی کمزور آواز ابھری۔
"ارجمند سے اس رات میں نے ہی کہا تھا۔ وہ ہر بات کے جواب میں خاموش رہے۔ مجھے تمہارا یہ الگ تھلگ رہنا

بلکہ غیر فطری انداز میں رہنا۔ بہت دکھ دیتا تھا۔ ساری دنیا ہمیں کہہ کہہ کر اور ہم تمہیں کہہ کہہ کر ہار گئے تھے۔ اور میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ اب یہ بچی مزید آزمائشوں میں پڑے۔ تم نے دیکھا ہے نا۔ اس کی صورت۔ کہو۔ لگتا ہے کوئی بے خبر سی بچی ہے۔ تمہیں اتنی اچھی بیوی شاید ہی مل پاتی۔
مجھے پتہ ہے میرے بچے! کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتے اور تم تو ایک نوجوان بیٹے کے باپ ہو۔ اگر تمہیں میرا انتخاب پسند نہیں آیا اور وہ لڑکی تمہارے دل میں گھر کرنے میں ناکام رہی ہے۔ تو بیٹے مجھے معاف کر دینا۔ خدا گواہ ہے میں نے تمہارا بھلا چاہا تھا۔
مگر دل صاف کر لو میرے بیٹے! کہ میں نے تمہیں غلط نہیں سمجھا۔ اگر تم ذرا غور کرتے تو شاید حیران ہوتے کہ میں نے صرف تم ہی پر شک کیوں کیا۔ ارجمند پر کیوں نہیں۔ آخر وہ تو زیادہ مجرم ٹھہرائے جانے کی حقدار تھی کہ وہ تمہارے کمرے میں تھی۔ اور میں نے اسے کچھ کیوں نہیں کہا؟ وہ ابھی تک اتنی عزت دار رہی سب کی نظروں میں۔ بس۔ بیٹے! امید ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے۔ ہو سکتا ہے تم دونوں معتوب ٹھہرتے اگر میں ارجمند کی باتیں نہ سن لیتا کہ ایک انسان ہوں فرشتہ تو نہیں۔ اول تو میری پہچان کھوئی نہیں ہے۔ دوسرے بچی واقعی بہت نیک ہے۔ اسے رہنمائی کی ضرورت تھی۔ رہنمائی پاتے ہی وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھی ہے کہ اپنی ہم عمر مسلمان بچیوں سے آگے جا نکلی ہے۔ میں اتنا خطاوار ہوں کہ میں نے تمہارا بھلا چاہا تھا۔"
وہ ٹیک لگائے آہستہ آہستہ اقرار جرم کر رہے تھے۔ اور وہاج حسین سر جھکائے شرمندہ بیٹھے تھے۔ والدین کی محبتوں کو کون پہنچ سکا ہے۔ وہ پشیمان تھے۔ اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں انہوں نے ابا میاں سے بدگمان ہو کر ایک ایک لمحہ کاٹا تھا کہ آخر ابا میاں میری صفائی سننے کو کیوں تیار نہیں ہوئے۔
"میں نے سلیمہ بیٹی سے بھی کہا تھا کہ وہ ارجمند سے معافی مانگ لے کسی کا دل دکھانا اچھی بات نہیں۔ ہمارے مذہب میں بہتان باندھنا انتہائی شرمناک فعل ہے۔ مجھے دکھ ہے کہ بچی نے ذہنی کوفت اٹھائی۔ میرا خیال تھا کہ تم مداوا کر دو گے۔"
وہ تھک سے گئے۔ اور تیز تیز سانس لینے لگے۔
"اور پھر یہ قدم میں نے ارجمند کی رضا اور خوشی سے

اٹھایا تھا۔ اگر مجھے تمہاری طرف سے ذرا بھی امید ہوتی کہ تم شادی پر رضامند ہو جاؤ گے تو میں یہ سب کچھ نہ کرتا۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اس دن میرے قدم خود بخود تمہارے کمرے کی طرف اٹھ گئے تھے۔

مجھے معاف کر دینا۔ مجھے بیک وقت تمہاری ماں اور باپ بن کر جینا پڑا ہے۔ مجھے اپنے بچوں پر ناز ہے۔ میری نظروں میں آج بھی تمہارا وہی مقام ہے جو ارجمند سے شادی سے قبل تھا۔ بیٹے! اس کا دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کرو۔ خدا ان مردوں کو بھی پسند نہیں کرتا جو بیویوں کے حقوق میں کوتاہی کرتے ہیں۔ اگر میری اولاد میرے بعد بھی نیکی کر کے خوشی پائے تو یہ میرا صدقۂ جاریہ ہو گا۔

بیٹے! روزِ حشر میرا سر نہ جھکا دینا۔ کہ خدا جس کو با اختیار بناتا ہے اس کے لیے کہتا ہے باز پرس بھی کروں گا۔ اب میری آبرو میرے بچوں کے ساتھ ہے۔" خوفِ خدا سے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ آواز گلوگیر ہو گئی۔

پشیمان سے وہاج حسین کھڑے ہو گئے۔

"ابا میاں! آپ لیٹ جائیں اور میری غلطیوں کو معاف فرمائیں۔"

ابا میاں نے ایک گہرا سانس لیا۔

"میرے بچو! میری طرف سے سب کے لیے معافی ہی معافی ہے۔ خدا تم جیسی فرمانبردار اور اطاعت گزار اولاد ہر مسلمان کو دے۔ سب کی اولاد کو آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے۔ تمام والدین کو رب العلمین توفیق دے کہ وہ اپنے بچوں کے فرائض سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہوں۔ اپنے حقوق ادا کریں۔"

ان کے لبوں سے دعاؤں کے آبشار پھوٹنے لگے تھے۔

ارجمند باہر کھڑی سوچتی رہی کہ اندر جائے یا نہ جائے۔ ایک دم ہی اس قدر جھجک آنے لگی تھی۔ مگر ابا میاں کی حالت کے پیشِ نظر اسے جانا پڑا۔ بھابی کچن میں خانساماں سے نپٹ رہی تھیں۔ ان کے آنے کا احتمال بھی تھا۔ سو وہ اندر چلی آئی۔ اس اچانک جھجک کی وجہ خود اس کی سمجھ میں بھی نہ آئی۔ دل کی آواز کو بھی شرما کر سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ جو کہہ رہا تھا۔ دعائیں قبول ہوا چاہتی ہیں۔ قدموں کی چاپ پر وہاج حسین نے سر گھما کر پیچھے دیکھا پھر چشمہ اتار کر رومال سے صاف کرنے لگے۔

وہ ابا میاں کے قریب چلی آئی۔

"کیسی طبیعت ہے ابا میاں؟" وہ ان پر جھک گئی۔

"دوسری طرف کا سفر شروع ہونے والا ہے۔ مستقل اچھا ہوں میری بیٹی!"

ارجمند کا دل بھر آیا۔ "ابا میاں! خدا آپ کو صحت کے ساتھ زندگی دے۔ مجھے نہ ڈرائیں۔ مجھے نہ ڈرائیں۔"

ابا میاں کی حالت ایسی نہیں تھی کہ انہیں تنہا چھوڑا جاتا۔ وہ ان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ سرخ ساڑھی کا آنچل اس نے سر پر پھیلا لیا۔ وہاج حسین کرسی پر بیٹھ گئے۔ منہاج حسین صبح سے شام تک ابا میاں کے پاس رہتے تھے۔ وہاج حسین نے انہیں آرام کے لیے بھیج دیا تھا۔ اسی دم صبیحہ بھابی اندر داخل ہوئیں۔ دونوں کو خاموش دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"کک — کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بھابی بیگم! ابا میاں کا بخار نہیں ٹوٹ رہا۔" وہاج حسین بولے۔ ابا میاں نے صبیحہ بھابی کو اپنے پاس بلایا۔ "میری بچی! پریشان کیوں ہوتی ہو۔ کوئی نئی بات تو نہیں۔ سب ٹھیک ہے تم لوگ اب آرام کرو۔"

"کر لیں گے ابا میاں! آرام بھی۔ ہم آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ کو اچھا نہیں لگتا؟"

بھابی بیگم ان پر جھک کر بولیں۔ ابا میاں نے اپنا متبرک ہاتھ ان کے سر پر رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ "اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھو۔ دین و دنیا کی خوشیاں پاؤ۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

وہاج حسین نے ان کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور بھابی بیگم سے گویا ہوئے۔

"حماد سے کہیے گاڑی نکالے۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

"حماد بیٹے! گاڑی نکالو۔" وہ باہر ہی سے آوازیں دینے لگیں۔

وہاج حسین نے باپ کا کمزور وجود اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ ابا میاں بے خبر سے تھے۔ ارجمند ان کے پیچھے چلی آئی۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ وہاج حسین نے انہیں سیٹ پر لٹا دیا۔ ان کا سر ارجمند کی گود میں تھا۔ صبیحہ بیگم نے میاں کو اٹھا دیا تھا۔

منہاج حسین گاؤن میں چلے آئے اور حماد سے کہا۔ "جاؤ بیٹا! تم جاؤ۔ اندر جاؤ۔" اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ان کے برابر میں وہاج حسین تھے۔

ہاسپٹل کے شفاف بستر پر ابا میاں بے خبر پڑے تھے۔ ان کا ہاتھ ارجمند کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دیر سے ایک ہی زاویے سے بیٹھی تھی۔ اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ ابا میاں سے اس کا کیا رشتہ تھا جو اس کی رگوں میں خون بن کے دوڑ رہا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد ارجمند کو محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں جیسے برف بھر گئی ہو۔ اس کا دل انجانے خدشے سے لرز گیا۔ ڈاکٹر نے اپنا سر اٹھایا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

منہاج حسین باپ پر جھک گئے اور کمالِ ضبط سے ان کا چہرہ ڈھانپ دیا۔

وہاج حسین فوراً باہر نکل گئے۔ اور ارجمند تڑپ تڑپ کر رو دی۔

"میری بیٹی! — میری بچی — !" کی خوش کن آوازیں پیراہن کر اس کا جگر چاک کرنے لگیں۔

"اس کے ہونٹوں پر سجا دوں گا محبت کے گلاب
وہ جو زندہ ہے میرے ساتھ خسارے لے کر"

چالیس دن میں جانے کتنی مرتبہ قرآن خوانی ہوئی تھی۔ اور ارجمند علیحدہ سے ان کے لیے قرآن ختم کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگتا جیسے ابا میاں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے ہوں۔ اور اس کی کسی غلطی پر کہہ رہے ہوں۔ "ہوں — اوں — یوں نہیں بیٹی — یوں۔"

گھر کے ہر فرد کو ان سے حقیقی محبت تھی۔ وہ سب کے دلوں میں تھے۔ سب بے حد اداس رہتے اور ارجمند کو تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس کا کوئی نہیں رہا۔

گھر خالی اور ویران نظر آنے لگا۔ سب اسے دور دور نظر آتے۔ وہ کانپ کر ایک ایک کی شکل دیکھتی۔ چہرے کے تاثرات پڑھتی۔ ہر اونچی آواز اس طرح لگتی گویا کہہ رہی ہو۔ "نکل جاؤ۔"

ان چالیس دنوں میں اس کا حال پاگلوں جیسا رہا۔ کوئی تعزیت کرتے آتا تو لپک کر اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور گویا چاہتی کہ وہ لوگ اسے بھی تعزیتی کلمات کہیں۔ وہ ان کی بہو ہے۔ کہیں تم لوگ بھول تو نہیں گئے۔ میں ان کی بہو ارجمند ہوں۔ ان کی بیٹی ارجمند ہوں۔ یہ گھر میرا بھی ہے۔ وہ میرے ابا میاں بھی تھے۔ یاد ہوں نا میں آپ لوگوں کو؟ مجھے دوبارہ دھکے تو نہیں ملیں گے۔ یہ میرا مستقل ٹھکانہ ہے نا؟

اس کا دل بے کل رہتا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں جائے نماز بچھائے برآمدے میں بیٹھی رہتی۔ وہاج حسین نے بہت مرتبہ یہ نظارے دیکھے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتے مگر وہ عجیب گم صم حالت میں رہتی۔ کبھی جائے نماز — کبھی قرآن — کبھی تسبیح۔

عجیب خوفزدہ سی نظر آتی۔ وہ عجیب کشمکش و پیچ میں تھے۔ بہت مرتبہ اسے بلانا چاہا مگر جانے کیوں رک جاتے۔

دل توڑنا کس قدر آسان تھا۔ وضو توڑنا کس قدر مشکل۔

وہ بہت دیر میں کمرے میں آتی تھی۔ انہیں زیادہ جاگنے کی عادت نہیں تھی۔ کل چالیسواں ہو چکا تھا۔ مگر اس کے اطوار وہی تھے۔

آج وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جائے نماز ایک طرف رکھی اور خاموشی سے پیٹھ موڑ کر لیٹ گئی۔

انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ رو رہی ہو۔ مدھم مدھم گھٹی گھٹی سسکیاں تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اور اس کا بازو تھام کر اپنی جانب موڑ لیا۔ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"کیوں رو رہی ہو؟ لگتا ہے تمہیں ہم سے زیادہ محبت تھی ابا میاں سے۔" ان کی بھاری آواز ابھری۔ اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

"تم نے بتایا نہیں کیوں رو رہی ہو۔؟"

اس نے سوچا۔ "دعائیں اس طرح قبول ہوتی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہاج حسین نے آہستگی سے پوچھا۔

"ارجمند! ابا میاں کے انتقال سے دو روز قبل تم رات کو اچانک کہاں چلی گئی تھیں؟"

(تو آپ جاگ رہے تھے) اسے وہ رات یاد آ گئی جب وہ جائے نماز پر سو گئی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا؟"

"مجھے بھی نہیں معلوم اس روز کہاں چلی گئی تھی میں۔"

اسے اپنی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔